فہرست

مضمون نگاران معارف

۱۶۷ ویں جلد

ماہ جنوری ۲۰۰۱ء تا ماہ جون ۲۰۰۱ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست مضامین

جلد ۱۶۷

ماہ جنوری ۲۰۰۱ء تا ماہ جون ۲۰۰۱ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جنوری ۲۰۰۱ء

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

ضیاء الدین اصلاحی

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (الہند) ۲۷۶۰۰۱

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسّی (۸۰) روپیے

پاکستان میں سالانہ دو سو (۲۰۰) روپیے — فی شمارہ سات روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ

ہوائی ڈاک بیس (۲۰) پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ : حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس. ایم. کالج. اسٹریچن روڈ. کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں. بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے. اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے. اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا.
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں.
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ (۵) پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی.

کمیشن ۲۵٪ ہوگا. رقم پیشگی آنی چاہیے.

جلد ۱۶۷ ماہ شوال المکرم ۱۴۲۱ھ مطابق ماہ جنوری ۲۰۰۱ء عدد ۱

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

مسلمانوں کی موجودہ ذلت وپستی اور ساری دنیا میں ان کی پسپائی اور خواری کی بنا پر عجب نہیں کہ اکثر لوگوں کی زبانوں پر علامہ اقبال مرحوم کا یہ شعر آجاتا ہو۔

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر   برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

یورپ اور اس کی حاشیہ بردار قوموں نے پوری دنیائے اسلام کو تنگ اور بے بس کر رکھا ہے اور ان کی ریشہ دوانیوں نے ان کی معاشرت، معیشت اور حکومت کا سارا نظام مفلوج اور درہم برہم کر دیا ہے، اس کی بنا پر یہی روح محمد ﷺ سے یہ فریاد کی جاتی ہوگی۔

شیرازہ ہوا ملت مرحوم کا ابتر   اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے
وہ لذت آشوب نہیں بحر عرب میں   پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کرائے روح محمد ﷺ   آیات الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

دردمند تڑپ رہے ہیں، دعائیں اور التجائیں کر رہے ہیں کہ ع "مشکلیں ملت مرحوم کی آساں کردے"، لیکن ادبار کی گھٹا پھیلتی اور چھاتی جارہی ہے۔

ہم کو اللہ سے شکوہ وگلہ کی مجال نہیں، اس کے یہاں اقوام کے عروج وزوال اور ترقی وتنزل کے بے لاگ اصول وقوانین ہیں، جن میں تغیر اور تبدیلی نہیں ہوتی، وہ نہ بندوں پر ظلم وجور کرتا ہے اور نہ ان سے زیادتی اور ناانصافی کا معاملہ کرتا ہے، مسلمانوں کو غور کرنا چاہئے کہ زمین اپنی وسعت کے باوجود ان کے لئے تنگ کیوں ہوگئی ہے، دنیا کی قومیں ان کو نیست ونابود کرنے کے لئے کیوں پل پڑی ہیں اور اپنی سازشوں سے سارے عالم اسلام کو کیوں تہ وبالا کرڈالا ہے، گردش روزگار کا یہ عجیب عبرت ناک منظر ہے کہ جو بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑاتے تھے اور جن کی ٹھوکر سے صحرا ودریا دونیم اور پہاڑ سمٹ کر رائی ہوجاتے تھے اور جن کو دیکھ کر بڑے بڑے لشکر جرار "دیواں آمدند" کہہ کر بھاگ کھڑے ہوتے تھے، آج وہ خس وخاشاک اور جھاگ کے مانند ہوگئے ہیں۔

یہ سب بخت واتفاق کا نتیجہ نہیں ہے، دنیا کے تمام واقعات وحوادث اللہ کے حکم سے ظہور پذیر ہوتے ہیں، اس کا کوئی فیصلہ عدل وحکمت سے خالی نہیں ہوتا، موجودہ حالات کے مسلمان خود ذمہ دار ہیں، عقائد وایمانیات کے ضعف اور اجتماعی وانفرادی اعمال کی خرابی نے ان کو ایسی جگہ پہنچا دیا ہے جہاں انہیں راستہ سوجھائی نہیں دیتا اور وہ تازیانہ الٰہی سے بھی سبق نہیں لیتے بلکہ اپنے حال میں

مست ہیں، افراد ہوں یا جماعتیں، عوام ہوں یا خواص، زعمائے قوم ہوں یا حکومتیں، کوئی اپنے رویے میں اصلاح وتبدیلی کیلئے تیار نہیں، نہ کسی کو اپنی بقاء وتحفظ کی فکر ہے اور نہ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس، مسلمانوں کے اتلاف کی جتنی سازشیں اور تدبیریں ہورہی ہیں، اس سے زیادہ ان کا افتراق وانتشار بڑھ رہا ہے، زوال وادبار کی اس گھنگھور گھٹا میں وہ کافرادا انہیں کہاں نظر آسکتا ہے، جو ان کے اس حرب وضرب اور باہمی تصادم اور ٹکراؤ کے پردے میں ہے۔

قوموں کو اتار چڑھاؤ اور نشیب وفراز سے مفر نہیں، بعض قوموں کے حالات کبھی کبھی اتنے پیچیدہ اور دشوار ہوگئے ہیں کہ کامیابی اور کامرانی کے تمام راستے بند اور ترقی وسربلندی کے سارے امکانات معدوم نظر آتے ہیں، لیکن یکا یک قدرت کی کارسازی سے مصائب وآلام کے بادل چھٹنے لگتے ہیں اور جس طرح رات کی تاریکی کے بعد سحر نمودار ہوتی ہے اسی طرح شدتوں اور ناگواریوں کے بعد آسانی اور خوش گواری کا دور آجاتا ہے اور محرومیوں اور ناکامیوں کے پردے سے امیدیں اور کامیابیاں جھانکنے لگتی ہیں اس لئے حالات کی تلخیوں سے گھبرانے اور پریشان ہونے کے بجائے ہمت وحوصلہ سے کام لینا اور مایوس وناامید ہونے کے بجائے اپنے حالات ومعاملات کی اصلاح اور عقائد واعمال کی خرابیاں دور کرنی چاہئے اور تخریب ہی میں تعمیر کی راہیں تلاش کرنی چاہئے۔ طوفانِ حوادث سے نکلنے اور ساحل مراد پر پہنچنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنا چاہئے، اللہ پر ایمان واعتماد اور عزم وہمت ہو تو طاغوتی لاؤلشکر پاش پاش ہوجائے گا۔

وزیراعظم نے اجودھیا کے تعلق سے جو ناروا، نازیبا اور شرمناک بیان دیا تھا اس سے اس وقت ملک کی فضا مسموم اور فرقہ وارانہ جنون بھڑک اٹھا ہے، اندیشہ ہے کہ دسمبر ۹۲ء میں جس طرح دم بھر میں بابری مسجد مسمار کردی گئی تھی اسی طرح چھن بھر میں اس کی جگہ مندر بن جائے جس کی پوری تیاریاں کرلی گئی ہیں اور جس کا اعلان برابر ہندو تنظیموں کی طرف سے ہوبھی رہا ہے۔ اب وزیراعظم فرماتے ہیں: "بابری مسجد کا انہدام ہندو اصولوں کے منافی تھا اور اگر کسی تنظیم نے اجودھیا میں موجودہ حالت تبدیل کرنے کی کوشش کی تو قانون اپنا کام کرے گا" متضاد بیانات دینا وزیراعظم اور ان کی پارٹی کا شیوہ ہے، جن لوگوں کو بابری مسجد کے سلسلے کی یقین دہانیوں کا تجربہ ہوچکا ہے وہ کیسے یہ باور کرسکتے ہیں کہ قانون اپنا کام کرے گا جب کہ خود وزیراعظم مسجد کے انہدام کے نامزد ملزموں کی صفائی دے رہے ہیں، گرم اور تلخ بیانات دینا ہندو تنظیموں کے سربراہوں کا وطیرہ ہے لیکن بعض مسلم لیڈروں کا وہی انداز اختیار کرنا مناسب نہیں ہے، ان کو وہی کہنا چاہئے جو وہ واقعی کرسکتے ہیں۔

ہمارے پاس قاری محمد میاں مظہری کا ایک گرامی نامہ آیا ہوا ہے وہ اس وقت خوش قسمتی سے اور بھارتیہ جنتا پارٹی کی مہربانی سے قومی اقلیتی ترقیاتی و مالیاتی کارپوریشن کے چیرمین ہیں۔ انہوں نے بابری مسجد کے مسئلہ پر لوک سبھا میں مرکزی وزیر مملکت جناب سید شاہ نواز حسین کی تقریر کا اردو ترجمہ بھیجا ہے، اس میں آزادی کے بعد سے بابری مسجد کے ساتھ ہونے والے واقعات کی پوری تفصیل بیان کی ہے، اس کا لب لباب یہ ہے کہ مسجد کو ۶؍دسمبر ۱۹۹۲ء کو کارسیوکوں نے نہیں توڑا بلکہ جب پہلی بار ۲۲ اور ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کو مورتیاں رکھی گئیں اور وہاں نماز پڑھنے پر پابندی لگائی گئی تو واقعتاً اسی دن بابری مسجد ٹوٹ گئی تھی، اس سلسلے میں کانگریسی حکومتوں کی کوتاہیوں اور بی جے پی کا ہوّا کھڑا کر کے مسلمانوں کو خوف زدہ کرنے کی شدید مذمت کرتے ہوئے اپنی پارٹی کو یہ کریڈٹ دیا ہے کہ مسلمانوں کے تئیں اس کی پالیسی صاف اور واضح اور کانگریس کی طرح منافقانہ نہیں ہے اور باجپئی جی کی شان میں یہ قصیدہ پڑھا ہے کہ ان کی سرکار میں مسلمان محفوظ ہیں اور امن و امان بھی ہے، وی پی سنگھ، لالو پرشاد، خصوصاً ملائم سنگھ کی اس لئے مذمت کی ہے کہ وہ کہتے تھے ایک چڑیا بھی اجودھیا میں نہیں پہنچ سکے گی لیکن ہزاروں لاکھوں کارسیوک پہنچ گئے اور مسجد کو نقصان پہنچادیا، اس طرح ۶؍دسمبر ۱۹۹۲ء ہی کو کارسیوک بابری مسجد کے اوپر نہیں چڑھے بلکہ اس کا سلسلہ ۳۰؍اکتوبر ۱۹۹۰ء ہی کو شروع ہوگیا تھا، غرض ہمارے وزیر نامدار نے سب کو موردِ الزام قرار دیا مگر اس میں نہ کہیں اڈوانی جی کی رتھ یاترا کا ذکر آیا نہ کلیان سنگھ کے حلف نامے کا اور نہ ۶؍دسمبر ۱۹۹۲ء کے انہدام کے "کارنامے" کا، ان کے خیال میں اس وقت مسجد مندر کا جھگڑا چھیڑ کر لوگ باجپئی جی کے پر امن دور میں خلل انداز ہونا چاہتے ہیں، حالانکہ اس وقت اس سلسلے کی ابتداء وزیر اعظم ہی نے کی تھی ع کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ضلع اعظم گڑھ کی سب سے قدیم اور ملک کی مشہور درس گاہ ہے، دینی تعلیم کے ساتھ صنعت و حرفت کی تعلیم بھی اس کے مقاصد میں داخل ہے تاکہ طلبہ معاشی حیثیت سے خود کفیل ہوں، جس کے لئے مولانا حکیم محمد مختار اصلاحی مدت سے جد و جہد کر رہے تھے، اب ان کے خاص تعاون سے دار الصنائع کی شاندار عمارت بڑی حد تک مکمل ہوگئی ہے اور حکیم صاحب کے مبارک ہاتھوں سے ۵؍جنوری ۲۰۰۱ء کو اس میں کمپیوٹر سنٹر کا آغاز ہوا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی عمر و صحت میں برکت اور دار الصنائع کو قوم کے لئے نافع بنائے۔ آمین! یہ تقریب بڑی سادگی سے منائی گئی تھی جس میں اس نواح کے مدرسہ کے ہمدردوں اور مخلصین کی بڑی تعداد شریک تھی۔ دار الصنائع کا قیام ان کی دیرینہ آرزوؤں کی تکمیل تھی۔ آخر میں حاضرین نے اس کی ترقی و استحکام کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔

مقالات

آسمان کیا ہے؟

بعض قرآنی حقایق تحقیقات جدیدہ کی روشنی میں

از
مولانا محمد شہاب الدین ندوی*

قرآنِ حکیم میں لفظ "سماء" اور "سماوات" کا ذکر ۳۱۰ جگہوں پر آیا ہے۔ مگر ہر جگہ ان کا مفہوم یکساں نہیں ہے۔ بلکہ سماء سے مراد کہیں پر ایک "محسوس شے" ہے تو کہیں اس سے مراد "مطلق بلندی" بھی ہے۔ کہیں پر اس سے مراد "عالم ملکوت" ہے تو کہیں پر "بادل" کو بھی سماء کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس کا اطلاق کہیں پر "آسمانی مادہ" پر ہے تو کہیں پر پورے "عالم شہود" پر ہے۔ اسی طرح "سماوات" کا اطلاق کہیں پر "سات آسمانوں" پر کیا گیا ہے تو کہیں پر اس سے مراد "اجرام سماوی" ہیں، جو ہر انسان کے مشاہدہ میں آسکتے ہیں اور ان اجرام میں ہمارا چاند اور سورج بھی داخل ہے۔ ان تمام کی تشریح و تفصیل کے لیے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔

اصل میں قرآنِ عظیم کا نزول چونکہ علوم و فنون سے ناآشنا قوموں کے درمیان ہوا تھا اس لئے ان تمام امور کو حد درجہ "مبہم انداز" میں بیان کیا گیا ہے۔ تاکہ دورِ قدیم میں ان کی تفہیم کے تعلق سے کوئی پیچیدگی یا کوئی نیا مسئلہ پیدا نہ ہوجائے۔ ظاہر ہے کہ دورِ قدیم میں اگر ہر چیز کا بیان صاف صاف انداز میں کر دیا جاتا تو اس صورت میں ایک نیا مسئلہ یہ پیدا ہوجاتا کہ لوگ کہہ دیتے کہ قرآن تو ایسی باتیں کر رہا ہے جو "ناقابلِ فہم"

---

* جنرل سکریٹری فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ بنگلور - ۲۹

ہیں اور ان کا مطلب اہلِ ایمان کو سمجھانا مشکل ہو جاتا۔ لہٰذا ایسے تمام "کائناتی حقائق" کا تذکرہ اس کتابِ حکمت میں مبہم انداز میں کیا گیا ہے۔ مگر الفاظ اتنے واضح اور معنی خیز ہیں کہ ان کا مفہوم تحقیقات جدیدہ کی روشنی میں بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ ان الفاظ (سماء اور سماوات) کا مفہوم کس جگہ کیا ہے؟ اور اس میں کسی قسم کی تاویل کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ بلکہ یہ الفاظ اپنے سیاق و سباق کے لحاظ سے ہر جگہ بالکل وضاحت کے ساتھ اپنے مدلول پر دلالت کرتے ہیں۔ بہر حال اس سلسلے میں ایک قاعدہ کلیہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ لفظ "سماء" کا اصل مفہوم ہے:

ہر وہ چیز جو ہمارے سروں کے اوپر ہو اور سایہ فگن ہو۔	کل ما علاک فاظلک فھو سماء[1]

اس سلسلے میں علامہ ابن منظور نے بھی لسان العرب میں تصریح کی ہے کہ:۔ ہر وہ چیز جو بلند ہو اور اوپر ہو اور اسی طرح ہر چھت کو بھی سماء کہا جاتا ہے اور گھر کی چھت کو بھی سماء کہا گیا ہے[2]

اسی ابہام سے فائدہ اٹھا کر ان الفاظ کا استعمال اس کلامِ حکمت میں انتہائی بلیغ طور پر اس طرح کیا گیا ہے کہ ان کے مفہوم میں قدیم دور والوں کو بھی کوئی اشتباہ نہ رہے اور وقت آنے پر ان کا صحیح مفہوم بھی واضح ہو جائے۔ چنانچہ دیکھئے ایک مقام پر "آسمان" کا صحیح مفہوم کس طرح واضح کیا گیا ہے:

اور ہم نے آسمان کو (اپنی زبردست) قوت کے ذریعہ بنایا ہے اور ہم اس میں وسعت دئے جا رہے ہیں۔	وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ (ذاریات: ۴۷)

کائنات کا آغاز و انجام اس موقع پر ایک سوال یہ ہے کہ یہ وسعت کس چیز میں ہے؟ تو اس سلسلے میں روایتی اعتبار سے پانچ اقوال مذکور ہیں جن میں سے ایک جدید نظریات کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ علامہ ابن جوزیؒ (م ۵۹۷ھ) اپنی تفسیر میں ابن زید کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ اس سے مراد آسمان میں وسعت

دینا ہے (القول) الثانی: لَمُوْسِعُوْنَ السَّمَآءَ، قالہ ابن زید[3]

چنانچہ آج فلکیاتی نقطۂ نظر سے ہماری کائنات (اپنی وسیع کہکشاؤں سمیت) کے آغاز و انجام کے بارے میں جو مقبول ترین نظریہ ہے وہ "نظریۂ عظیم دھماکہ" (بگ بینگ تھیوری) کہلاتا ہے، جس کی رو سے ہماری پوری کائنات ابتداً گیس کے ایک گولے کی شکل میں تھی، جس میں ایک عظیم دھماکہ ہوا اور اس مادہ کے اجزا بکھر کر کہکشاؤں اور ستاروں کے روپ میں ظاہر ہو گئے اور کہکشاؤں کی یہ کائنات مسلسل پھیلتی جا رہی ہے۔ کیونکہ دوربینی مشاہدہ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ کہکشاؤں کا فاصلہ باہم بڑھتا جا رہا ہے اور وہ ایک دوسرے سے دور ہوتی جا رہی ہیں۔ پھر جب وہ پھیلتے پھیلتے اپنی آخری حد تک پہنچ جائیں گی اور مزید پھیلاؤ کے لئے گنجائش باقی نہیں رہے گی تو اس وقت سکڑنے کا عمل شروع ہو جائے گا اور پھر تمام کہکشائیں (اپنے کھربوں کھربوں ستاروں سمیت) سکڑتے سکڑتے پھر اسی نقطہ تک پہنچ جائیں گی جہاں سے ان کا آغاز ہوا تھا۔ نتیجہ یہ کہ پھر ایک زبردست اور خوفناک قسم کا دھماکہ ہوگا جس کے نتیجہ میں یہ پوری کائنات ختم ہو کر رہ جائے گی اور اس کے بعد یہ عمل اسی طرح برابر جاری رہے گا اور یہ نظریہ پہلی بار ۱۹۲۷ء میں قائم کیا گیا تھا[4]

چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ ابتدائی دھماکہ تقریباً ۱۵ ارب سال پہلے واقع ہوا تھا۔

Big Bang theory, the most generally acepted in cosmology which states that the universe began in primordial explosion about 15 billion years ago (5)

واضح رہے اگرچہ یہ ایک نظریہ ہے جس کی ابھی تک پوری طرح تصدیق نہیں ہو سکی ہے۔ لیکن اگر کوئی نظریہ قرآنی نصوص (واضح بیانات) سے بغیر کسی تاویل کے پوری طرح ہم آہنگ ہو جائے تو اسے رد کرنے کی بھی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ اگر بالفرض یہ نظریہ بدل بھی جائے تو قرآن کا وہ مفہوم جو منصوص

طور پر ثابت ہے وہ کسی بھی طرح بدل نہیں سکے گا۔ بلکہ اس کی جگہ کوئی اور اچھا سا مفہوم جو اس کی صداقت کو واضح کرنے والا ہو نکل آئے گا۔ جیسا کہ خود سابقہ مفسرین کے بیان کئے ہوئے بہت سے معانی و مطالب جدید اکتشافات کے تحت بدلتے رہتے ہیں، جن کی وجہ سے قرآنِ عظیم کی قطعیت پر کوئی حرف نہیں آتا اگر میں ان سب کی مثالیں دینا شروع کر دوں تو اس سے ایک ضخیم کتاب وجود میں آسکتی ہے۔ لہذا قرآنِ حکیم کی نئی تفسیر کرنے کے سلسلے میں آج کل جو شبہہ پیدا کیا جاتا ہے وہ بے بنیاد ہے اور اس موضوع پر راقم سطور نے مفصل بحث اپنی ایک دوسری کتاب میں کی ہے۔

آسمان اور جدید سائنس اس بحث سے بخوبی واضح ہو گیا کہ قرآن کی نظر میں سماء سے مراد (اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے) یہ پورا سلسلہ وجود ہے اور بقیہ چھ سماوات اس کے علاوہ ہیں جو ہماری آنکھوں سے مستور ہیں۔ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

بہر حال قرآنِ حکیم کی نظر میں جہاں کہیں بھی "آسمان" کے پھٹنے اور اس کے شق ہونے کا بیان ہے تو اس سے مراد یہی پورا "عالم شہود" ہے، جس میں تمام اجرام سماوی اور جملہ کہکشائیں بھی شامل ہیں اور اس توجیہ و تفسیر سے جدید حلقوں کی اس بے اعتباری کا ماحول بھی ختم ہو سکتا ہے جو قرآنی نظریہ سماوات کے سلسلے میں آج پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ جدید سائنس کا نظریہ یہ ہے کہ "آسمان" کوئی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ ہماری آنکھوں کو دکھائی دینے والی "نیلی چادر" کا کوئی وجود نہیں ہے۔ بلکہ خلاؤں میں یہ "آسمان" سیاہ نظر آتا ہے۔ جیسا کہ خلابازوں نے اس سلسلے میں مشاہدہ کیا ہے۔ نیز مشاہدہ سے یہ بھی بخوبی ظاہر ہو گیا کہ زمین سے نظر آنے والی یہ نیلی چیز اور خلاؤں سے دکھائی دینے والی سیاہ چیز کوئی ٹھوس شئے نہیں، بلکہ حدِ نظر کا محض ایک منظر ہے۔ لہذا ایک مشاہداتی چیز کا انکار دین کی نظر میں جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے سائنس دانوں اور سائنس کو صحیح ماننے والوں کی نظر میں دین غیر معتبر قرار پا سکتا ہے، جیسا کہ اس سلسلے میں امام غزالیؒ نے تحریر کیا ہے: "وہ ثابت شدہ حقائق جو اصول دین سے متصادم نہ ہوں ان میں جھگڑا

کرنا جائز نہیں ہے۔" اور قرآن عظیم نے کہیں بھی یہ نہیں کہا کہ آسمان کا رنگ "نیلا" ہے یا ہماری آنکھوں کو نظر آنے والی نیلی چادر ہی آسمان ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن حکیم حد درجہ حکیمانہ کلام ہے جس میں اس قسم کی کوئی بات مذکور نہیں جسے جدید سے جدید تر اکتشافات چیلنج کر سکیں۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآنِ عظیم کی تصریح کے مطابق ایک "ٹھوس آسمان" کا وجود ضرور ہے جسے وہ "سقف محفوظ" قرار دیتا ہے اور دنیائے سائنس کی ابھی وہاں تک رسائی نہیں ہو سکی ہے اور اس کی حقیقت اس پر تب کھلے گی جب ہماری "پھیلتی ہوئی" کائنات چاروں طرف سے بند اس چھت سے ٹکرا کر اپنے "مرکز" کی طرف لوٹنا شروع ہو جائے گی، جس کے نتیجے میں پھر ایک عظیم دھماکہ ہوگا۔ جیسا کہ خود سائنس دانوں کا نظریہ ہے اور اس چھت کے پرے بقیہ چھ سماوات واقع ہیں، جن کی حقیقت سے انسان واقف نہیں ہے۔ بہر حال اس سلسلے میں ارشاد باری ہے جو "نص قطعی" کی حیثیت رکھتا ہے۔

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا	اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت
وَهُمْ عَنْ اٰيَاتِهَا مُعْرِضُوْنَ۔	بنا دیا ہے۔ (مگر) یہ لوگ اس کی نشانیوں
(انبیاء: ۳۲)	سے اعراض کر رہے ہیں۔

کائنات کا ڈراپ سین ظاہر ہے کہ پھیلتی ہوئی کائنات کا دوبارہ اپنے مرکز کی طرف واپس آنا کسی ٹھوس چیز سے ٹکرانے ہی کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔ لہذا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری یہ پوری مشہود کائنات کسی عظیم ترین "گنبد" میں بند ہے جہاں تک سائنس کی رسائی نہیں ہو سکی ہے۔

اس بحث سے بخوبی ظاہر ہو گیا کہ قرآنِ عظیم کی نظر میں آسمان یا سماء کا مفہوم کیا ہے۔ لہذا اب ملاحظہ فرمائیے قرآن کی وہ آیات جن میں سماء یا پوری کائنات کے پھٹنے کا تذکرہ موجود ہے، جو اختتامِ کائنات سے عبارت ہے۔

إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ ۔ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ (انفطار: ۱-۲)

جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب ستارے جھڑ پڑیں گے۔

إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ (انشقاق: ۱)

جب آسمان شق ہو جائے گا۔

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ نَفْخَةٌ وَاحِدَةٌ وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً فَيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ وَانْشَقَّتِ السَّمَاءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَاهِيَةٌ (حاقہ: ۱۳-۱۶)

جب صور یکبارگی پھونکا جائے گا اور زمین اور پہاڑ ایک ہی چٹکی میں چور چور کر دئے جائیں گے۔ اس دن برپا ہونے والی چیز (قیامت) برپا ہو جائے گی اور آسمان پھٹ جائے گا جو اس دن بالکل بودا ہوگا۔

فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ وَإِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ وَإِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ وَإِذَا الرُّسُلُ أُقِّتَتْ لِأَيِّ يَوْمٍ أُجِّلَتْ لِيَوْمِ الْفَصْلِ (مرسلات: ۸-۱۳)

جب ستارے مٹا دئے جائیں گے، جب آسمان پھاڑ دیا جائے گا۔ پہاڑ اڑا دئے جائیں گے اور تمام رسولوں کو وقت مقررہ پر جمع کیا جائے گا۔ یہ تاخیر کس دن کے لئے کی گئی؟ فیصلے کے دن کے لئے۔

السَّمَاءُ مُنْفَطِرٌ بِهِ كَانَ وَعْدُهُ مَفْعُولًا (مزمل: ۱۸)

(اس دن) آسمان پھٹ جائے گا۔ اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔

ان آیات میں آسمان کے لئے انفطار، انشقاق اور فرج کے الفاظ لائے گئے ہیں جو ہم معنی ہیں یعنی پھٹنا اور چونکہ آسمان ستاروں اور سیاروں سے عبارت ہے اس لئے آسمان کے پھٹنے کا مطلب ہے تمام ستارے اور سیارے پھٹ کر بکھر جائیں گے۔ اس لحاظ سے اوپر مذکور سورۂ انفطار کی پہلی آیت میں آسمان کے پھٹنے کا جو تذکرہ ہے اس کی مزید وضاحت بعد والی آیت (وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ)

کر رہی ہے یعنی آسمان کے پھٹنے کی کیفیت کیا ہوگی؟ تو اس کی کیفیت یہ ہوگی کہ تمام ستارے جھڑ پڑیں گے یا بکھر جائیں گے اور یہ ستارے کس طرح جھڑ پڑیں گے؟ تو اس حقیقت پر سورۂ تکویر کی پہلی آیت روشنی ڈال رہی ہے کہ وہ ہمارے سورج کی طرح یا تو بے نور ہو جائیں گے یا پھر اچانک دھماکوں سے پھٹ پڑیں گے جس کی تفصیل پچھلے مضمون میں بیان کی جا چکی ہے اور اس اعتبار سے یہ تمام آیتیں ایک ہی مفہوم پر دلالت کر رہی ہیں اور ان میں کوئی معنوی تضاد نہیں ہے واللہ اعلم۔

آسمان کے دروازے

اس موقع پر یہ حقیقت بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ قرآن حکیم میں جہاں کہیں بھی آسمان کے پھٹنے اور اس کے بکھر کر منتشر ہونے کا ذکر آیا ہے وہاں پر صرف لفظ سماء (واحد) آیا ہے، سماوات (جمع) کا لفظ نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ختم ہونے والا آسمان صرف ہمارا یہی آسمان ہے اور بقیہ چھ آسمان بالکل محفوظ رہیں گے۔ یہ بھی اس بات کا ایک ثبوت ہے کہ ان آیات میں آسمان سے مراد صرف عالم شہود یا آسمان اول ہے اور بقیہ چھ آسمان اس کے علاوہ ہیں جو ہماری نظروں سے مستور ہیں اور قرآن عظیم یہ بھی انکشاف کرتا ہے کہ قیامت کے دن آسمان اول کے دروازے کھول دئے جائیں گے جو ایک "مضبوط چھت" یا گنبد کی شکل میں ہے۔

إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا (نبا: ۱۷-۱۹)

فیصلہ کا دن یقیناً متعین ہے۔ جس دن کہ صور پھونکا جائے گا تو تم سب گروہوں کی شکل میں (ہمارے روبرو) حاضر ہو جاؤ گے اور آسمان کھول دیا جائے گا تو (اس میں) دروازے نکل آئیں گے۔

اور اس کا مزید ثبوت وہ حدیثیں ہیں جو واقعہ معراج سے تعلق رکھتی ہیں۔ چنانچہ اس واقعہ میں صراحتاً مذکور ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر آسمان کی سیر

کے لئے روانہ ہوئے تو سب سے پہلے آسمان اول تک پہنچے اور اس کے متعدد دروازوں میں سے ایک دروازہ کھلوایا، جیسا کہ صحیح بخاری میں مذکور ہے:

ثُمَّ عَرَجَ بِهٖ اِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَضَرَبَ بَابًا مِّنْ اَبْوَابِهَا فَنَادَاهُ اَهْلُ السَّمَاءِ مَنْ هٰذَا؟ فَقَالَ جِبْرَئِيْلُ قَالُوْا وَمَنْ مَّعَكَ؟ قَالَ مَعِيَ مُحَمَّدٌ...[8]

پھر جبرئیلؑ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر "نزدیکی آسمان" تک پہنچے اور اس کے (متعدد) دروازوں سے ایک دروازہ کھٹکھٹایا تو آسمان والوں نے پکار کر پوچھا کہ کون ہے؟ تو کہا جبرئیل۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ کہا کہ محمد

بخاری ہی کی ایک دوسری روایت میں اس طرح مذکور ہے:

فَلَمَّا جِئْتُ اِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا قَالَ جِبْرَئِيْلُ لِخَازِنِ السَّمَاءِ اِفْتَحْ[9]

جب میں آسمان دنیا تک پہنچا تو جبرئیل نے آسمان کے خازن سے کہا کہ (دروازہ) کھولو

قرآن اور حدیث کے اس متفقہ بیان کے بعد اس بارے میں کسی قسم کا شبہ نہیں رہ جاتا کہ آسمان کا وجود اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے، جس کی نقاب کشائی کرنا سائنس کی ذمہ داری ہے۔

بروج یا کائناتی جزائر اس اعتبار سے یہ آسمانی چھت دوربینوں سے نظر آنے والی کہکشاؤں (گیلکسیس) سے پرے ہونی چاہئے۔ بالفاظ دیگر دوربینوں سے نظر آنے والی تمام کہکشائیں "سمائے دنیا" یا قریبی آسمان کے اندر واقع ہیں اور اس کا مزید ثبوت حسب ذیل آیات میں مذکور لفظ "بروج" ہے جس سے مراد مشہور بارہ آسمانی برجوں کے علاوہ کہکشائیں (ستاروں کے مجموعے) بھی ہو سکتے ہیں:

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ (حجر: ۱۶)

یقیناً ہم نے آسمان میں (بہت سے) برج بنادئے ہیں اور انہیں بغور دیکھنے والوں کے لئے مزین کر دیا ہے۔

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ (بروج: ۱)

(ہاں ہاں) یہ برجوں والا آسمان بھی شاہد ہے

تفسیروں میں بروج کے کئی معانی مذکور ہیں۔ صاحب تفسیر کبیر نے لکھا ہے کہ اس سلسلے میں تین اقوال ہیں: (۱) اس سے مراد آسمان کے مشہور بارہ برج ہیں، جن میں سورج داخل ہوتا ہے (۲) اس سے مراد چاند کی منزلیں ہیں۔ (۳) اس سے مراد بڑے بڑے ستارے ہیں[10]۔

ابن جریر طبریؒ (م ۳۱۰ھ) نے لکھا ہے کہ اہل علم کا اس کی تاویل میں اختلاف ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک اس سے مراد قصور (محل) ہیں جو آسمان میں واقع ہیں۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد ستارے ہیں اور بعض نے اس کی تاویل اس طرح کی ہے: وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ سے مراد وَالسَّمَاءِ ذَاتِ النُّجُوْمِ ہے[11]۔

اس اعتبار سے بروج کے معنی میں کافی وسعت پائی جاتی ہے اور ان سب اقوال کا حاصل ایک ہی ہے۔ کیونکہ جس طرح مشہور بارہ برج ستاروں کا مجموعہ ہیں۔ اسی طرح کہکشائیں بھی ستاروں کے مجموعوں ہی کا نام ہے۔ فرق یہ ہے کہ بارہ برجوں میں صرف چند ستارے ہوتے ہیں۔ جب کہ کہکشائیں لاتعداد (اور ایک موٹے اندازہ کے مطابق ایک کہکشاں میں کم از کم ایک کھرب) ستارے ہوتے ہیں۔ چنانچہ سائنسی نقطۂ نظر سے اس کی تعریف اور وضاحت اس طرح کی گئی ہے "کہکشاں" (گیلکسی) سے مراد ستاروں (نجمی) گرد اور گیس کا مجموعہ ہے، جس کا کُل وزن ہمارے سورج کے مقابلے میں ایک کروڑ سے لے کر دس کروڑ تک ہے۔ دودھیا راستہ (ملکی وے) ہماری اپنی کہکشاں ہے اور سورج اس کہکشاں میں موجود ایک کھرب ستاروں کے مقابلہ میں صرف ایک ستارہ ہے۔ تاہم ۱۹۲۰ء کے دہے تک کہکشاؤں کی صحیح ساخت کے بارے میں واقفیت نہیں تھی، جب کہ شدید جدوجہد کے بعد ان کے طبیعی احوال

معلوم کر لئے گئے۔ چنانچہ ماؤنٹ ولسن میں نصب شدہ سوانچ قطر والی عکسی دوربین (ریفلیکٹر) اس مقصد کے لئے استعمال کی گئی۔ اس کے نتیجے میں "انڈرومیڈا" کہکشاں میں واقع انفرادی ستاروں کا تصور حاصل ہوا۔

Galaxy, an association of stars, dust and gas, with a total mass ranging from 10^{9} to 10^{13} times the mass of the sun. The Milky Way is our own galaxy, and the Sun is only one star of the 100 billion stars in it. The true character of galaxies was not discovered until the 1920s when the very intense debate concerning their nature was finally resolved. Telescoped prior to this period showed them as diffuse areas of light, resembling nebulae, but the 100-inch (2.5 m) reflector at the Mount Wilson Observatory, first used in the 1920s, gave images of some individual stars in the Andromeda Galaxy showing it to be a galaxy rather than a nebula..(12)

واقعہ یہ ہے کہ اس صدی کی دوسری چوتھائی کے دوران ماہرین فلکیات بتدریج اس حقیقت سے واقف ہوئے کہ بہت سے ماند اور مدہم "سحابیے" (نیبولاس) جو ہمارے آسمان کو آباد کئے ہوئے ہیں، وہ حقیقتاً ستاروں کے عظیم جزیرے ہیں جو ہماری کہکشاں سے پرے واقع ہیں۔ ایک مثالی اور بڑی کہکشاں، جیسے ہماری چکر دار کہکشاں ایک کھرب ستاروں پر مشتمل ہوتی ہے اور ہماری کائنات میں دوربینوں سے دکھائی دینے والی اربوں کہکشائیں موجود ہیں اور یہ تمام کہکشائیں قرآن عظیم کی صراحت کے مطابق وَزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ کی شکل میں "جمال ربوبیت" کا نظارہ فراہم کرتی ہیں اور اس اعتبار سے یہ "آسمانی بروج" وہ "کائناتی جزیرے" ہیں جن پر حضرت ابن عباسؓ کا قول "قصور السماء" کے الفاظ ٹھیک ٹھیک صادق

آتے ہیں۔

اس بحث سے بخوبی ظاہر ہوگیا کہ یہ پوری کائنات قرآنی نقطۂ نظر سے چاروں طرف سے ایک "ٹھوس" چیز سے گھری ہوئی ہے، جسے بعض مواقع پر "بناء" اور بعض مواقع پر "سقف محفوظ" کہا گیا ہے۔

آسمان دنیا کی محیر العقول وسعت الغرض ہمارے آسمان (سمائے دنیا) کی وسعت اس قدر زیادہ ہے کہ اس سلسلے کے محیر العقول اعداد و شمار سے سر چکرانے لگتا ہے۔ ہماری اس مشہود کائنات کے اجرام اس قدر بعید فاصلے پر واقع ہیں کہ ان کی روشنی ان کے وجود کے بعد سے لے کر اب تک ہماری زمین تک نہیں پہنچ سکی ہے۔ حالانکہ روشنی ایک سکنڈ میں ۱۸۶۰۰۰ میل کا فاصلہ طے کرتی ہے اور ہماری کائنات کو وجود میں آئے ہوئے تقریباً دس ارب سال گزر چکے ہیں۔ جس کہکشاں میں ہمارا سورج واقع ہے اس میں کم از کم ایک کھرب ستارے موجود ہیں اور اس کہکشاں کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک کا فاصلہ ایک لاکھ نوری سال ہے۔ جب کہ بعض کہکشاؤں کا قطر چند ہزار نوری سال سے لے کر نصف ملین (پانچ لاکھ) نوری سال تک ہے۔

Galaxies range in diameter from a few thousand to half a million light-years. (13)

روشنی ایک سال میں ۹۴۶۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ کیلومیٹر کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ کہکشائیں اپنی جسامت اور شکل و صورت میں مختلف ہوتی ہیں۔ بعض کہکشائیں چکر دار اور بعض بیضوی شکل کی ہوتی ہیں اور یہ مختلف شکل و صورت کی کہکشائیں متعدد گروپوں میں منقسم ہیں۔ ہماری کہکشاں (ملکی وے) جس گروپ میں ہے اس میں بیس کہکشائیں موجود ہیں اور ان کا قطر تین ملین (تیس لاکھ) نوری سال ہے۔ اس مجموعے میں "انڈرومیڈا" کہکشاں بیس لاکھ نوری سال کے فاصلے پر واقع ہے۔

Our own galexy is a member of the "local group" an association

of about 20 galaxies, only one of which is the andromeda galaxy. The local group is about three.million light-years away. (14)

ہماری کہکشاؤں کے مجموعے سے قریب ترین کہکشاؤں کا بڑا مجموعہ "ورگو" ہے، جو تیس ملین (تین کروڑ) نوری سال کے فاصلے پر واقع ہے۔

The nearest large cluster of galaxies is in virgo about 30 million light years distant. (15)

ماہرین فلکیات کے اندازے کے مطابق کہکشاؤں کے یہ مجموعے یا گروپ مل کر "سوپر گروپس" کی تشکیل کرتے ہیں (یعنی بہت سے مجموعے مل کر ایک گروپ بن جاتے ہیں) جن میں تقریباً ایک سو مجموعے ہوتے ہیں، جو ایک سو ملین (دس کروڑ) نوری سال کے فاصلے میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔

Some astronomers have argued that there is evidence that clusters are grouped into superclusters of perhaps 100 members, spread over 100 million light-years. (16)

ہماری معلوم شدہ کائنات میں اس طرح کے لاکھوں کروڑوں مجموعے ہیں جن میں اربوں کہکشائیں پائی جاتی ہیں اور ہماری بعید ترین کہکشاؤں کا فاصلہ ہماری زمین سے اربوں نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ چنانچہ مختلف دریافت شدہ کہکشاؤں کی شناخت کے لئے انہیں خصوصی نمبر دئے گئے ہیں۔ مثلاً انڈرومیڈا میں واقع "بڑے سحابیہ" (گریٹ نیبولا) کو M31 کا نمبر دیا گیا ہے اور ان نمبروں کے ذریعہ ان کا محل وقوع معلوم کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ کہکشاں M33 ہماری زمین سے بیس لاکھ نوری سال کے فاصلے پر ہے۔

"منکوسکی" نامی مجموعہ کہکشاں سے روشنی ہماری طرف پانچ ارب سال پہلے آنی شروع ہوئی تھی۔

اس لئے ہم یقین کر سکتے ہیں کہ بعض کہکشائیں اس سے زیادہ قدیم ہوں گی۔ ایک اندازہ کے مطابق ہماری اور دیگر کہکشائیں دس ارب سال سے زیادہ قدیم نہیں ہیں۔ (حوالہ مذکور)

بہرحال فلکیات کی دنیا میں بیسویں صدی کی سب سے زیادہ دلچسپ اور رعب دار دریافت ہماری کائنات میں اربوں کہکشاؤں کا وجود ہے، جو منظم طور پر ایک دوسرے سے پیچھے ہٹ رہی ہیں۔

Perhaps the most startling discovery made in astronomy this century is that the universe is populated by billions of galaxies and that they are systematically receding from one another. (17)

اور یہ اندازہ "نظریہ عظیم دھماکہ" (بگ بینگ تھیوری) کے مطابق ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کی رو سے جب ہماری اس معلوم کائنات کا پورا مادہ باہم ملا ہوا تھا تو اس میں ایک عظیم دھماکہ ہوا جس کے نتیجے میں تمام کہکشائیں اور ستارے و سیارے وجود میں آئے اور یہ تمام ستارے اور ان کے مجموعے (کہکشائیں) تب سے اب تک برابر پھیلتے چلے جارہے ہیں۔ چنانچہ پچھلے صفحات میں پیش کردہ ایک قرآنی آیت (ذاریات: ۴۷) سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

غرض کہکشاؤں کی دنیا بہت زیادہ دلچسپ اور بصیرت افروز ہے جو قدرت خداوندی کا ایک بے مثال مظہر اور اس کی عظمت و کبریائی کی دلیل ناطق ہے اور اس کے نظارہ سے ہمارے ایمان و یقین میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ سب کچھ حسب ذیل آیت کریمہ کے عین مطابق ہے:

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجاً وَّزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ (حجر: ۱۶)	اور ہم نے آسمان میں بہت سے بروج (ستاروں کے مجموعے) بنادئے ہیں اور انہیں غور سے دیکھنے والوں کے لئے آراستہ کردیا ہے۔

ماہرین فلکیات اب تک لاکھوں کہکشاؤں کی تصویریں دوربینوں کی مدد سے اتار چکے ہیں، جن سے بعض فلکیات کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں اور بعض تصویریں مذکورہ بالا کتاب "نیو فرنٹیرس اِن اسٹرانمی" میں بھی موجود ہیں۔ ہر کہکشاں کی اپنی ایک الگ پہچان ہے، جو ایک دوسرے سے مختلف و منفرد دکھائی دیتی ہے۔ ابتدا میں یہ کہکشائیں "روشن سحابیوں" کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ مگر طاقتور دوربینوں کے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ سب ستاروں کے مجموعے ہیں، جن میں سے بعض ہمارے سورج سے بھی کئی گنا بڑے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کہکشائیں "ستاروں کے شہر" یا کائنات کے جزائر" ہیں۔ ان میں بعض عجیب و غریب اجرام بھی موجود ہیں، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

اربوں نوری سال کے فاصلے پر واقع ان کہکشاؤں کے ملاحظے سے ہماری کائنات کی حیرت انگیز وسعتوں کا پتہ چلتا ہے اور اس فاصلے کو میلوں کے عدد میں ظاہر کرنا ناممکن ہے۔ اگر کوئی شخص ایک ایسے خلائی جہاز کے ذریعہ سفر کرنا شروع کر دیتے جو روشنی کی رفتار سے چلتا ہو تب بھی وہ پوری کائنات تو درکنار ایک کہکشاں سے دوسری تک نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ وہ راستے ہی میں بوڑھا ہو کر ختم ہو جائے گا۔

عرش کے مقابلے میں سات آسمانوں کی حیثیت

بہر حال قرآنی دلائل کے مطابق راقم سطور کی نظر میں ہماری یہ پوری کائنات آسمان اول کے اندر واقع ہے اور بقیہ چھ آسمان اس کے علاوہ ہیں، جو ہماری آنکھوں سے مستور ہیں اور مستقبل میں مزید جتنی بھی کہکشائیں دریافت کی جائیں گی، وہ سب کی سب آسمان اول ہی کا حصہ ہوں گی۔ کیونکہ "نظر آنے والی" یا مشہود کائنات بنص قرآنی "سمائے دنیا" میں واقع ہے۔ آسمان دنیا کے ملاحظے سے بقیہ چھ آسمانوں کی وسعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مگر یہ ساتوں آسمان اپنی حیرت ناک وسعتوں کے باوجود عرش الٰہی کے مقابلے میں ایک رتی سی چیز کے مانند ہیں، جیسا کہ حسب ذیل حدیث سے واضح ہوتا ہے:

عن ابی ذر قال: قلت یا رسول اللہ ایما انزل علیک اعظم؟ قال آیۃ الکرسی، ثم قال یا ابا ذر ما السماوات السبع مع الکرسی الا کحلقۃ ملقاۃ بارض فلاۃ۔ وفضل العرش علی الکرسی کفضل الفلاۃ علی الحلقۃ[18]

حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ میں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ پر سب سے عظیم (آیت) کون سی نازل ہوئی؟ آپ نے فرمایا کہ آیت الکرسی۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اے ابوذر ساتوں آسمان کرسی سمیت ایک حلقے دیا ایک رتی سی چیز) کی طرح ہیں جو ایک وسیع بیابان میں ڈال دیا گیا ہو اور عرش کی فضیلت کرسی پر ایسی ہی ہے جیسے ایک وسیع بیابان میں ایک (چھوٹا سا) حلقہ۔

سات آسمانوں کے اوپر جنت ہے اور جنت کے اوپر عرش الٰہی ہے۔ چنانچہ جنت کی وسعت ہمارے آسمان جیسے سو آسمانوں کی وسعت کے برابر ہے۔ جیسا کہ بخاری شریف کی ایک حدیث سے واضح ہوتا ہے

ان فی الجنۃ مائۃ درجۃ، اعدھا اللہ للمجاھدین فی سبیلہ، کل درجتین ما بینھما کما بین السماء والارض فاذا سالتم اللہ فاسئلوہ الفردوس فانہ اوسط الجنۃ واعلی الجنۃ وفوقہ عرش الرحمن ومنہ تفجر انھار الجنۃ[19]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں سو درجے ہیں، جن کو اللہ نے اپنے راستے میں جہاد کرنے والوں کے لئے تیار کر رکھا ہے۔ ان میں سے ہر دو درجوں کے درمیان اس قدر فاصلہ ہے جتنا کہ زمین اور آسمان کے درمیان ہے۔ جب تم اللہ سے مانگو تو فردوس مانگو۔ کیونکہ وہ جنت کا درمیانی اور اونچا مقام ہے۔ جنت الفردوس کے

اوپر اللہ کا عرش ہے، اسی سے جنت کی
نہریں نکلتی ہیں۔

زمین اور آسمان اللہ کی مٹھی میں ان عجیب اور حیرت ناک اعداد و شمار کی رو سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ پوری کائنات (ساتوں آسمانوں اور جنت سمیت) کس قدر وسیع و بے کراں ہوگی یہ پوری کائنات عرش الٰہی کے مقابلے میں ایک حقیر سی چیز ہے جو اس کی مٹھی میں سماجائے گی۔ چنانچہ باری تعالیٰ قیامت کے موقع پر اس پوری کائنات کو ایک ہاتھ میں اٹھالے گا جیسا کہ اس سلسلے کی صحیح ترین حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے۔

عن ابی مسعود قال جاء حبر من الاحبار الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا محمد إنا نجد ان اللہ یجعل السماوات علی اصبع، والارضین علی اصبع، والشجر علی اصبع، والماء والثری علی اصبع، وسائر الخلق علی اصبع، فیقول انا الملک، فضحک النبی صلی اللہ علیہ وسلم حتی بدت نواجذہ تصدیقا لقول الحبر ثم قرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ
(زمر/۶۷)

ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ یہودیوں کا ایک عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ اے محمد ہم (اپنی کتابوں میں) لکھا ہوا پاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ (قیامت کے موقع پر) آسمانوں کو ایک انگلی پر رکھ لے گا اسی طرح زمینوں کو ایک انگلی پر، درختوں کو ایک انگلی پر، پانی کو ایک انگلی اور باقی تمام مخلوقات کو ایک انگلی پر رکھے گا اور کہے گا کہ میں ہی بادشاہ ہوں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہودی عالم کی تصدیق کے طور پر ہنس پڑے حتی کہ آپ کے دانت دکھائی دینے لگے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی جس کا مفہوم یہ ہے: اور انھوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے اور یہ پوری

زمین قیامت کے دن اس کی مٹھی میں ہوگی، اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپیٹے ہوئے ہوں گے۔ وہ مشرکوں کے شرک سے پاک اور برتر ہے۔

اس سلسلے کی ایک دوسری حدیث یہ ہے:

یقبض اللہ الارض و یطوی السماء بیمینہ، ثم یقول انا الملک این ملوک الارض [۲۱]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے موقع پر اللہ تعالیٰ زمین کو اپنے قبضے میں لے لے گا اور آسمان کو لپیٹ کر اپنے داہنے ہاتھ میں کرے گا۔ پھر کہے گا کہ میں بادشاہ ہوں زمین کے بادشاہ کہاں ہیں؟

ایک اور روایت کے مطابق وہ فرمائے گا کہ میں ہی (حقیقی) بادشاہ ہوں، کہاں ہیں (دنیا کے) جبار اور متکبر لوگ؟ [۲۲]

اس بحث کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۔ ہماری معلوم و مشہود کائنات سمائے دنیا یا آسمان اول میں داخل ہے جو "سقف محفوظ" کے اندر واقع ہے اور اس سقف محفوظ تک سائنس کی ابھی تک رسائی نہیں ہوسکی ہے۔

۲۔ بقیہ چھ آسمان اس کے علاوہ ہیں، جو ہماری آنکھوں سے مستور ہیں۔

۳۔ ہماری یہ زمین اور ساتوں آسمان "کرسی" کے مقابلے میں بے وقعت ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی کرسی ساتوں آسمانوں کی "پوری کائنات" کا احاطہ کئے ہوئے ہے (وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ)

۴۔ ساتوں آسمانوں کی پوری کائنات کرسی سمیت عرش الٰہی کے مقابلے میں ایک وسیع بیابان میں ایک رتی سی چیز کے مانند ہے۔

۵۔ قیامت کے موقع پر ساتوں آسمان (اربوں کھربوں کہکشاؤں اور لاتعداد اور ان گنت ستاروں اور سیاروں سمیت) اور ان میں موجود تمام مخلوقات خدائے ذوالجلال کے داہنے ہاتھ میں (ایک چھوٹی سی گیند کے مانند) ہوں گے[۲۳]۔ اس سے خدائے جبار و قہار کی عظمت و بزرگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۶۔ اس بحث کا خاص الخاص نکتہ یہ ہے کہ خالق ارض و سماوات کا وجود حقیقی واقعی ہے، نہ کہ قدیم متکلمین کے نظریہ کے مطابق محض "بسیط" یا وہمی، جنھوں نے یونانی فلسفے سے متاثر ہو کر بے کار اور لاطائل بحثیں چھیڑ دی تھیں۔

۷۔ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات سے الگ (بائن) ہے اور وہ عرش پر متمکن ہو کر سارے جہاں پر حکمرانی کر رہا ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ	تمہارا رب یقیناً اللہ ہے، جس نے آسمانوں
وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى	اور زمین کو چھ دن (چھ مدارج) میں پیدا
عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِى الَّيْلَ النَّهَارَ	کیا، پھر وہ عرش پر مستوی ہوا۔ وہ رات کو
يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ	دن پر ڈھانپ دیتا ہے جو اس کے پیچھے
وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ	تیزی سے آجاتی ہے اور سورج چاند اور
الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ	ستارے (سب کے سب) اس کے حکم کے
الْعٰلَمِيْنَ (اعراف: ۵۴)	تابع ہیں۔ جان لو کر (تمام مخلوقات کو)
	پیدا کرنا اور ان پر حکم چلانا اسی کا کام ہے۔
	اللہ بڑی برکت والا ہے جو سارے جہان کا رب ہے۔

مراجع و حواشی

[۱] فقہ اللغۃ وسر العربیۃ، ابو منصور ثعالبی، ص ۱۶، مطبوعہ مصر ۱۹۵۴ء [۲] لسان العرب، ابن منظور، ۲۹۸/۱۴، دار صادر، بیروت [۳] زاد المسیر فی علم التفسیر، ابن جوزی: ۳۱/۸، دمشق ۱۹۶۷ء [۴] دیکھئے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (خورد): ۱۰/۲، ۱۹۸۳ء [۵] Oxford Encyclopedia, Vol.8, P.15, New York, 1993. [۶] تہافۃ الفلاسفۃ، از امام غزالی، ص ۱۴۱، دار المشرق، بیروت، ۱۹۹۰ء [۷] یعنی "سورج کی موت اور قیامت" [۸] بخاری کتاب التوحید ۲۰۴/۸، مطبوعہ استانبول، ۱۹۸۱ء [۹] بخاری کتاب الصلوٰۃ ۹۱/۱-۹۲ [۱۰] ایضاً [۱۱] تفسیر کبیر: ۱۱۴/۳۱، دار الفکر [۱۲] تفسیر ابن جریر ۸۱/۳۰، دار المعرفۃ بیروت ۱۴۰۰ء [۱۳] Oxford Illustrated Encyclopedia, Vol.8, P.55 Oxford University Press, Oxford 1993. [۱۴] The World Book Encyclopedia, Vol.8 P.10, 1996. [۱۵] New Frontiers in Artronomy. P.224. Freeman & Company, San Francisco, 1975. [۱۶] Ibid. [۱۷] Ibid, P.222 [۱۸] Ibid.

[۱۸] اس حدیث سے علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ میں استدلال کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ اس حدیث کو ابن حبان اور احمد بن حنبلؒ نے روایت کیا ہے (فتاویٰ ابن تیمیہؒ: ۵۵۶/۶) [۱۹] بخاری کتاب التوحید ۱۷۶/۸ [۲۰] بخاری کتاب التفسیر: ۳۳/۶، مسلم کتاب صفات المنافقین: ۲۱۴۷/۴، دار الافتاء ریاض ۱۴۰۰ء [۲۱] بخاری کتاب الرقاق: ۱۹۴/۷، مسلم: ۲۱۴۸/۴ [۲۲] بخاری و مسلم [۲۳] دیکھئے فتاویٰ ابن تیمیہؒ: ۵۶۲/۶، مطبوعہ دار الافتاء ریاض۔

ابن نفیس

دوران خون کو دریافت کرنے والا مسلم سائنس داں

از جناب عبدالرحمن شریف صاحب*

اب ساری دنیا کو یہی معلوم ہے کہ جسم میں دوران خون کو ۱۶۲۸ء میں انگریز سائنسداں ولیم ہاروے William Harvey نے دریافت کیا تھا۔ لیکن اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ اس سے بھی چار سو سال قبل ایک مسلمان سائنسداں ابن نفیس نے دوران خون کو دریافت کیا تھا۔ اس نے ۶۴۰ھ/۱۲۴۲ء میں ریوی دوران خون کو جسے انگریزی میں Pulmonary Circulation of the blood کہتے ہیں دریافت کیا اور اس کا حال اپنی دو کتابوں میں لکھا۔ ریوی دوران خون Pulmonary Circulation of the blood عام دوران خون کا ایک حصہ ہے جس کی دریافت سے ابن نفیس دنیا کے عظیم سائنسدانوں میں شمار کیا جانے لگا اور بلاشبہ یہ اس کی اولیات اور اسلامی سائنس کے عظیم کارناموں میں سے ایک ہے۔

قلب دو خانوں بائیں حصے (Left Atri um Ventricle) اور دائیں حصے (Right Atri um Ventricle) میں بٹا ہوا ہے۔ ان دونوں کے درمیان گوشت کی ایک ٹھوس اور سخت دیوار ہے جسے انگریزی طبی اصطلاح میں Septum کہتے ہیں۔ بدن میں خون کے دو راستے ہیں۔ شرائین کے ذریعہ خون قلب سے خارج ہوکر بدن میں پھیلتا ہے۔

---

* ۸/۶ نیو مہاکالی روڈ، اندھیری، ممبئی۔

اور وریدوں کے ذریعہ واپس ہوکر قلب میں داخل ہوتا ہے۔ بدن میں شرائین (Arteries) اور وریدوں (Veins) کا ایک جال سا پھیلا ہوا ہے۔ شرائین جیسے جیسے قلب سے دور ہوتی جاتی ہیں ویسے ویسے چھوٹی ہوتی جاتی ہیں اور آخر میں یہ Capillaries پر ختم ہوجاتی ہیں جہاں سے وریدیں شروع ہوتی ہیں۔ اس طرح شریانوں اور وریدوں کے درمیان Capillaries پائے جاتے ہیں جہاں سے خون کا الٹا سفر شروع ہوتا ہے۔

پورے جسم کا ایک دورہ کرنے کے بعد خون ورید کے ذریعہ قلب کے دائیں خانے میں داخل ہوتا ہے اور وہاں سے شریان کے ذریعہ باہر نکل کر پھیپھڑوں میں داخل ہوتا ہے۔ پھیپھڑوں سے گزر کر یہ خون قلب کی طرف واپس لوٹتا ہے لیکن اب کی بار وہ بائیں خانے میں داخل ہوتا ہے اور وہاں سے شریان کے ذریعہ باہر نکل کر پورے بدن کے ایک اور دورے پر نکل پڑتا ہے۔

دوران خون کے دو حصے ہیں۔ عام یا عظیم دوران خون Greater Circulation اور ریوی دوران خون Pulmonary Circulation وہ دوران خون جو پھیپھڑوں کے سوا سارے جسم کا احاطہ کرتا ہے اسے Greater Circulation کہتے ہیں اور وہ دوران خون جو قلب سے پھیپھڑوں اور پھیپھڑوں سے واپس ہوکر قلب تک محدود رہتا ہے اسے ریوی دوران خون یعنی Pulmonary Circulation کہتے ہیں۔

پورے جسم میں دوڑنے کے بعد خون میں آکسیجن OXYGEN کی کمی ہوجاتی ہے۔ جب یہ ناقص خون قلب کے دائیں خانے میں پہنچتا ہے اور وہاں سے پھیپھڑوں میں جاکر وہ آکسیجن حاصل کرتا ہے (پھیپھڑوں میں آکسیجن سانس کے ذریعہ پہنچتی ہے۔) اس کے بعد پھر وہ قلب کے بائیں خانے میں داخل ہوتا ہے۔ دوران خون کا یہ چھوٹا سفر قلب سے پھیپھڑوں اور پھیپھڑوں سے واپس ہوکر قلب تک محدود ہے۔

اپنی تحقیق سے ابن نفیس نے دوران خون کے اس دوسرے حصہ یعنی ریوی دوران خون

Pulmonary Circulation کو دریافت کیا اور اس کو بالکل صاف لفظوں میں یوں بیان کیا ہے :

"ہم یہ کہتے ہیں اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ قلب کا ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ روح SPIRIT تیار کرے۔ ہلکے اور صاف خون کے لئے (جو بدن میں دورے کے بعد قلب میں داخل ہوتا ہے) یہ ضروری ہے کہ وہ ہوا سے ملے۔ دونوں کے ملنے سے جو مرکب تیار ہوتا ہے اس سے روح بنتی ہے۔ ہلکا ہونے کے بعد یہ ضروری ہے کہ خون قلب کے بائیں خانے میں داخل ہو جہاں 'الروح الحیوانی' بنتی ہے۔ لیکن دونوں خانوں کے درمیان کوئی راستہ نہیں ہے کیونکہ ان کے درمیان گوشت کی جو دیوار ہے وہ موٹی، سخت اور ٹھوس ہے جس میں کوئی سوراخ یا مسامات نہیں دکھائی دیتے ہیں جیسا کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے اور نہ اس میں کوئی غیر مرئی سوراخ ہے، جیسا کہ جالینوس (Galen) کا خیال تھا۔ یہاں قلب کے مسامات مسدود ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اس میں کوئی شک نہیں کہ ہلکا ہونے کے بعد خون شریان ریوی کے ذریعہ پھیپھڑوں میں چلا جاتا ہے جہاں یہ ہوا سے ملتا ہے۔ ہوا سے ملنے کے بعد خون وریدوں کے ذریعہ پھر سے قلب کے دو خانوں میں سے بائیں خانے میں داخل ہوتا ہے اور روح حیوانی کے پیدا کرنے کے قابل بن جاتا ہے۔"

ریوی دوران خون Pulmonary Circulation of the blood کی دریافت اور اس کے متعلق بالکل صحیح بیان سے ابن نفیس نے ایک اور کارنامہ یہ انجام دیا کہ یونانیوں کے اس ایک ہزار سالہ مفروضہ کو اس نے غلط ثابت کر دیا کہ قلب کی درمیانی دیوار Septum میں سوراخ یا مسامات ہیں اور خون قلب کے ایک خانے سے دوسرے خانے میں براہ راست داخل ہوتا ہے۔ یہ مفروضہ قدیم یونان کے مشہور سائنسداں جالینوس GALEN (۱۲۹ء - ۱۹۹) کا قائم کردہ تھا جس نے یہاں تک کہا تھا کہ قلب کی درمیانی دیوار میں جو سوراخ ہیں وہ غیر مرئی ہیں، جن کے ذریعہ

خون ایک خانے سے دوسرے خانے میں داخل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جالینوس نے غیر مرئی مسامات کی بات اسی لئے کہی تھی کہ اسے (یا اس دور کے دوسرے سائنسدانوں کو) قلب کی درمیانی دیوار میں کوئی سوراخ دکھائی نہیں دیا تھا مگر اس کے باوجود اسے اپنا مفروضہ قائم رکھنا تھا۔ یہ واضح رہے کہ اس دور میں کسی حد تک قلب اور دوسرے اعضاء کے مطالعہ و تشریح کا آغاز ہو چکا تھا۔ ایک سچا سائنسداں نئے شواہد کی بنا پر پرانے مفروضات کو رد کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا ہے۔ اسلام کے ابتدائی اور وسطی دور میں جالینوس کو بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور اس کے خیالات کو طبی دنیا میں حتمی حیثیت حاصل تھی۔ الرازی اور بوعلی سینا بھی اس کے خیالات سے اتفاق رکھتے تھے۔ لیکن ایک اچھا سائنسداں ہونے کے ناطے ابن نفیس نہ جالینوس یا کسی اور سائنسداں سے مرعوب ہوا اور نہ اس نے ان کے خیالات کو بلا تامل قبول کیا بلکہ اس نے جالینوس کی تحریروں کا غائر مطالعہ کیا اور ان پر تنقیدی نظر ڈالی اور انہیں اپنی ذاتی تحقیق، مطالعہ اور مشاہدہ کی روشنی میں جانچا اور جب اس کی ذاتی تحقیق نے اس کی رہنمائی ایک بالکل ہی الگ بات کی جانب کی تو اس نے صاف لفظوں میں لکھا کہ جالینوس کا بیان غلط تھا۔

اس زمانے میں جب اسلامی دنیا میں جالینوس کے افکار کو حتمی حیثیت حاصل تھی انہیں غلط بتانا بڑے حوصلہ کا کام تھا۔ ابن نفیس نے لکھا ہے کہ اعضاء کی تشریح کے معاملہ میں اس نے اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کو دوسروں کے خیالات پر فوقیت دی ہے۔ اسے اس کی پروا نہیں کہ اس کے خیالات سابق اطباء کے بیان کے مطابق ہیں یا مخالف۔ اس طرح ابن نفیس نے قلب کی صحیح تشریح بھی کی اور کسی حد تک اس کے عمل کو بھی بیان کیا۔

ابن نفیس نے ریوی دوران خون Pulmonary Circulation of the blood کی دریافت غالباً ۶۴۲ھ/۱۲۴۲ء میں قاہرہ میں کی ہوگی یعنی ولیم ہاروے سے چار سو سال اور

سرویٹو اور کولمبو سے تین سو سال پہلے اس نے اپنی دو کتابوں میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں شرح القانون اور شرح تشریح القانون گو بو علی سینا کی شہرۂ آفاق کتاب القانون کی شرحیں ہیں تاہم ابن نفیس کی جدت و ابتکار کی وجہ سے یہ اوریجنل Original اور طبع زاد کتابیں معلوم ہوتی ہیں۔ شرح تشریح القانون کا ایک مخطوطہ امریکہ کے کیلیفورنیا یونی ورسٹی میں موجود ہے۔ اسے ابن نفیس کی وفات سے تقریباً ۴۰ سال پہلے یعنی ۱۲۴۱ء میں نقل کیا گیا تھا۔

یہ درست ہے کہ ولیم ہاروے نے دوران خون کے مطالعہ کو بہت ہی مفید اور اہم صورت دی ہے لیکن اسے دوران خون کو دریافت کرنے والا ہرگز نہیں مانا جاسکتا۔ اس کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دوران خون کو ثابت کرنے کے لئے کچھ ٹھوس ثبوت فراہم کئے اور یہ کہا کہ قلب ایک پمپ کی طرح کام کرتا ہے اور خون کو جسم کے سبھی حصوں تک پہنچاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے شرائین Arteries خون کو قلب سے پورے جسم میں پہنچاتی ہیں اور وریدیں VEINS خون کو جسم سے واپس لے جاکر قلب میں پہنچاتی ہیں۔ لیکن شرائین کہاں ختم ہوتی ہیں اور خون کو واپس لانے والی وریدیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں۔ یہ بات ولیم ہاروے کو معلوم نہیں ہوسکی تھی دراصل شرائین کے آخری سرے پر نہیں Capillaries ہوتے ہیں جہاں سے وریدیں شروع ہوتی ہیں Capillaries کو صرف طاقتور خوردبینوں کی مدد سے دیکھا جا سکتا ہے جو ولیم ہاروے کے زمانے میں موجود نہیں تھیں۔ ۱۶۶۱ء میں طاقتور خوردبینوں کی دریافت کے بعد Capillaries کا مشاہدہ کیا گیا جس سے وریدوں کے ذریعہ خون کی واپسی کا حتمی ثبوت ملا۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ CAPILLARIES کی دریافت کا سہرا بھی تیرہویں صدی کے ایک اسلامی سائنسداں ہی کے سر ہے۔

چند سال پہلے تک یہ سمجھا جا رہا تھا کہ ریوی دوران خون Pulmonary Circulation

کو سولہویں صدی کے وسط میں مائیکل سرویٹو (Micheal Servito) اور ریالڈو کولمبو Realdo Colombo نامی دو یورپین نے دریافت کیا لیکن اب میرہوف Max Meyerholf جیسے مغربی محققین نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان دونوں مصنفین نے ریوی دوران کا مضمون ابن نفیس کی کتاب سے نقل کیا تھا۔

اسپینی عیسائی عالم سرویٹو اور اطالوی سائنسداں کولمبو نے اپنی کتابوں میں ریوی دوران خون Pulmonary Circulation پر جو مضمون لکھا ہے وہ موضوع اور لسانی اعتبار سے ابن نفیس کے مضمون سے بہت ملتا جلتا ہے جس کی بنا پر محققین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ دونوں ہی مصنفین ابن نفیس کی تحریروں سے واقف تھے۔ دوسری بے شمار اسلامی سائنسی کتابوں کی طرح ابن نفیس کی کتابوں کا بھی لاطینی میں ترجمہ ہوا ہوگا جن سے ان یوروپی مصنفوں نے استفادہ کیا ہوگا لیکن انہوں نے ابن نفیس کا ذکر کئے بغیر اس کی دریافت کو اپنے نام سے لکھ دیا۔ اس سلسلہ میں اطالوی مصنف اور مترجم آندریہ الپاگو Andrea Alpago کا نام لیا گیا ہے جس کی موت کولمبو اور سرویٹو کی موت سے قریب چالیس سال قبل ۱۵۲۰ء میں ہوئی۔ الپاگو ایک طویل عرصہ تک اسلامی ممالک میں مقیم رہا۔ وہ اسلامی کتابوں کو اکٹھا کرتا تھا اور ان کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کر کے انہیں اٹلی روانہ کرتا تھا۔ یہ امر قابل غور ہے کہ الپاگو اٹلی کے پڈوا یونی ورسٹی سے وابستہ تھا جہاں بعد میں ولیم ہاروے نے طب کی تعلیم حاصل کی۔ پڈوا ان دنوں طبی تعلیم کے لئے مشہور تھا۔

علاء الدین ابوالحسن علی بن الحزم ابن نفیس کی ولادت ۶۰۷ھ ۱۲۰۸ء کو دمشق کے قریب قرشیہ نامی گاؤں میں ہوئی۔ قرشیہ اور دمشق کی نسبت سے اس کے نام کے ساتھ القراشی اور الدمشقی بھی لکھا جاتا ہے۔ وہ ایک دبلے پتلے جسم والا قدآور شخص تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اس نے طبی تعلیم حاصل کرنے کے لئے دمشق کے مشہور طبیہ کالج اور ہسپتال "بیمارستان النوری

الکبریٰ" میں داخلہ لیا۔ بیمارستان النوری کو نور الدین محمود بن زنگی نے قائم کیا تھا۔ اسلامی دور میں طبیہ کالج کے ساتھ ہسپتال بھی ہوا کرتا تھا تاکہ تعلیم میں سہولت ہو۔ مشہور عالم دین اور طب کے ماہر مہذب الدین عبدالرحیم بن علی الدخوار بیمارستان النوری میں ابن نفیس کے استاد تھے۔ الدخوار نے اپنے کئی شاگردوں کو طب میں کمال حاصل کرنے میں مدد دی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ابن نفیس نے دمشق ہی میں اپنی کاروباری زندگی کی ابتدا کی اور تقریباً کہولت میں قاہرہ منتقل ہوا جہاں اس نے اپنی باقی زندگی گزار دی۔

قاہرہ میں اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ مملوک سلطان الظاہر بیبرس البندوق دھاری نے اسے اپنا ذاتی طبیب مقرر کیا۔ اس کے علاوہ وہ دو ہسپتالوں اور ایک مدرسہ سے وابستہ رہا۔ صلاح الدین ایوبی کے قائم کردہ بیمارستان الناصری میں وہ رئیس الاطباء کے عہدہ تک پہنچا۔ دوسرا ہسپتال جس سے وہ وابستہ تھا وہ بیمارستان القلاؤن تھا جو دار الشفاء کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ یہ ہسپتال ۱۷۹۸ء تک قائم رہا۔ اس کے کھنڈرات آج بھی اسلامی دور کی عظمت یاد دلاتے ہیں۔ قاہرہ کے مدرسہ مسروریہ میں ابن نفیس فقہ پر لیکچر دیا کرتا تھا۔ وہ فقہ کا عالم تھا اس کا ثبوت یہ ہے کہ تاج الدین سبکی نے اپنی کتاب طبقات الشافعیۃ الکبریٰ میں اس کا نام شامل کیا ہے

ابن نفیس نے قاہرہ میں کافی دولت کمائی۔ وہ ایک عالی شان مکان میں رہتا تھا۔ جہاں علمی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں، جن میں علماء و شرفاء شریک ہوتے تھے۔ ابن نفیس نے ۲۰ ذی قعدہ ۶۸۷ھ/ ۱۷ دسمبر ۱۲۸۸ء کو اسی سال کی عمر میں قاہرہ میں وفات پائی۔ آخری ایام میں وہ سخت بیمار تھا۔ جب دواؤں سے افاقہ نہ ہوا تو طبیبوں نے مشورہ دیا کہ وہ آخری علاج کے طور پر تھوڑی سی شراب پی لے۔ لیکن ابن نفیس نے یہ کہہ کر شراب پینے سے انکار کر دیا کہ وہ بدن میں

شراب لے کر اپنے خالق کے سامنے نہیں جانا چاہتا۔

یہ افسوس ناک امر ہے کہ ابھی تک ابن نفیس کی کتابوں کا جدید انداز سے مطالعہ نہیں ہوا ہے اس کے صرف چند اقتباسات کا ترجمہ ہوا ہے جن سے دنیا نے یہ جانا ہے کہ اس نے ریوی دورانِ خون Pulmonary Circulation کو دریافت کیا۔ ابن نفیس کی مکمل طبی دنیا فنون اور خیالات کو جاننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی کتابوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے اور انکا انگریزی اردو اور دوسری اہم زبانوں میں ترجمہ کیا جائے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ اس کے سائنسی کارناموں کو سمجھنے میں مزید مدد ملے گی بلکہ یہ بھی اندازہ ہوگا کہ کیا وہ عام دورانِ خون کا علم رکھتا تھا یا نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ جب وہ ریوی دورانِ خون کے بارے میں جانتا تھا تو یہ بعید از قیاس نہیں کہ وہ عام دوران خون کے بارے میں بھی جانتا رہا ہوگا۔

ماخذ و مراجع

* A Study of Ibn Nafis, E·Edward Bitter Bulletin of the history of Medicine, Vol . 29 , 1955 P. 429, 352 - 368
* Arabian Contribution to Medicine, S. Haddad, Annals of Medical History Vol 3 1941, P 70 - 71 .
* Introduction to the history of Science George Sarton, Baltimore 1927, Vol II P 1096 - 1101.
* Encyclopaedia of Islam, Old and new edition, entry Ibn Nafis .
* Kashful - Zunoon Haji Khalifa .
* Ibn Nafis and his theory of the lesser circulation, M Mayerholf, Isis vol Vol 23 , 1955, P 100 - 120

حافظ کی غزلوں میں ہجو وطنز کے موارد

از ڈاکٹر عبدالرب عرفان ٭

خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی (وفات: ۷۹۲ھ/ ۱۳۹۰ء) فارسی کے ان معدودے چند شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں جو بقائے دوام کے دربار میں بلند ترین مقامات پر فائز ہیں۔ اگر بقول معروف فردوسی، انوری اور سعدی پیمبران سخن ہیں[1] تو حافظ خدائے سخن۔ جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے ان کا کوئی ہمسر ہوا ہے اور نہ مستقبل میں ہونے کی امید ہے۔

حافظ کا وطن ولادت شیراز ہے جو اس زمانے میں دانش و فرہنگ کا اتنا بڑا مرکز تھا کہ اسے "دار العلم" کہا جاتا تھا۔ حافظ نے پرورش، تربیت اور تحصیل علم کے جملہ مراحل وہیں طے کئے۔ شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا۔ وہ بڑے رنگین اور دل کش شعر کہتے تھے۔ اس اعتبار سے وہ سرآمد غزل سرایاں بن گئے۔ ان کے اشعار کی طرح طرح سے تاویلات کی جانے لگیں۔ ان کے رندانہ مضامین میں تصوف اور عشق حقیقی کے پہلو نکالے جانے لگے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے رندی اور سرمستی کے مضامین اپنے زمانے کے معاشرتی حالات سے اٹھائے ہیں۔ اس زمانے کا شیراز گوناگوں شرعی برائیوں کا مرکز بنا ہوا تھا اور بقول حافظ شیخ و حافظ و مفتی و محتسب سبھی تزویر کر رہے تھے[2] یہ حافظ کے مشاہدات تھے اور وہ اپنے آپ کو اپنے مشاہدات کے اظہار سے کس طرح روک سکتے؟ حافظ کی شاعری کے اس پہلو کو نمایاں کرنے کے لئے ان کی شاعری کے ابتدائی دور کا سرسری جائزہ لیا جاتا ہے۔

خواجہ صاحب نے اپنی شاعرانہ زندگی میں پانچ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ ان تمام کا ذکر انہوں نے

٭ غالب روڈ۔ وارث پورہ۔ کامٹی ضلع ناگ پور۔

اپنے اشعار میں کیا ہے۔ خواجہ کا پہلا ممدوح اور مربی شیخ ابو اسحٰق اینجو (وفات: ۷۵۷ھ/ ۱۳۵۶ء)[3] تھا۔ ابو اسحٰق شعر و سخن کا دلدادہ، شراب و کباب کا بے حد شوقین، عیش کوش اور آرام طلب تھا لیکن امور مملکت سے انتہائی بے پروا اور بے نیاز تھا۔ اس کے زمانۂ حکومت میں حافظ نے بڑی شگفتہ، رنگین اور رندی و سرمستی کے دل کش رنگ و آہنگ میں ڈوبی ہوئی غزلیں کہی ہیں۔ مثلاً ایک غزل جس کے ایک شعر میں ابو اسحٰق کے ایک حاشیہ نشیں حاجی قوام الدین حسن (وفات: ۷۵۴ھ/ ۱۳۵۳ء) کی مدح کی ہے[4]، کے تین شعر درج ذیل ہیں:

ساقی بنور بادہ برافروز جام ما — مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم — اے بیخبر ز لذت شرب مدام ما

چنداں بود کرشمۂ ناز سہی قداں — کاید بجلوہ سرو صنوبر خرام ما

ان اشعار سے شیخ ابو اسحٰق کے زمانے میں حافظ کے رنگ سخن کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔

اسی زمانے میں یزد کے حاکم امیر مبارز الدین ابن مظفر (وفات: ۷۶۵ھ/ ۱۳۶۳ء)[5] نے توسیع مملکت کے ارادے سے شیراز پر متعدد حملے کئے مگر ہر بار بات مصالحت پر ٹل گئی۔ اس کا آخری حملہ ۷۵۷ھ (۱۳۵۶ء) میں ہوا جس میں شاہ ابو اسحٰق کو شکست ہوئی۔ وہ فرار ہوا مگر گرفتار کر کے شیراز لایا گیا اور قتل کر دیا گیا۔[6]

ہجو امیر مبارز الدین امیر مبارز الدین اپنے دینی موقف میں بڑا درشت مزاج، سخت گیر اور متقشف تھا۔ اس نے شہر کے تمام شراب خانوں کو تالے لگوا دئے اور احکام شرع کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزائیں دینے لگا۔ رندوں کی محفلیں اجڑ گئیں اور وہ اس کا ذکر "محتسب" اور "محتسب بزرگ" کے کنایہ آمیز الفاظ کیساتھ کرنے لگے۔ شراب چھپ کر پی جانے لگی۔ ساز (چنگ و عود) خاموش ہو گئے۔ حالات کی اس تبدیلی نے حافظ کا لہجہ بھی بدل دیا۔ ان کی لے مدہم ہو گئی۔ اب وہ

اس انداز کے شعر کہنے لگے :

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلریزست   ببانگ چنگ مخور مے کہ محتسب تیزست

در آستین مرقع پیالہ پنہاں کن   کہ ہمچو چشم صراحی زمانہ خونریزست

زرنگ بادہ بشوئید خرقہ ہا از اشک   کہ موسم ورع و روزگار پرہیزست

ایک دوسری غزل میں فرماتے ہیں :

دانی کہ چنگ و عود چہ تقریر می کنند   پنہاں خورید بادہ کہ تعزیر می کنند

ناموس عشق و رونق عشاق میبرند   عیب جوان و سرزنش پیر می کنند[9]

یہ درست کہ رندوں کو شراب پیتے ہوئے یا نشہ کی حالت میں گرفتار کرنے کے لئے خود امیر مبارز الدین نہیں جاسکتا تھا لیکن یہ کاروائیاں اس کے حکم سے ہوتی تھیں یعنی ان میں بالواسطہ اس کا ہاتھ ہوتا تھا اس لئے محتسب کے پس پردہ بیشتر امیر پر طنز کیا گیا ہے۔ کبھی وہ محتسب کی دورنگی، صوفی کو دکھاتے ہیں اور کبھی پیرے فروش سے اس کے بارے میں دریافت فرماتے ہیں :

صوفی ز کنج صومعہ با پائے خم نشست   تا دید محتسب کہ سبو می کشد بدوش

احوال شیخ و قاضی و شرب الیہود شاں   کردم سوال صبحدم از پیرے فروش

گفتا: نہ گفتنیست سخن گرچہ محرمے   درکش زبان و پردہ نگہ دار و مے بنوش[10]

یہ محض شاعرانہ انداز بیان نہیں۔ ان میں حالات کی ہو بہو عکاسی نہ سہی لیکن حالات کی جانب اشارہ ضرور ملتا ہے۔

ہجو عماد فقیہ کرمانی امیر مبارز الدین کے بیٹے شاہ شجاع نے ۷۵۹ھ (۱۳۵۷ء) میں اپنے باپ کی آنکھوں میں سلائی پھروا کر اسے اندھا کر دیا اور خود تخت و تاج پر قبضہ کر لیا۔ تخت نشینی کے ساتھ ہی اس نے سارے شراب خانوں کے کھول دئے جانے کا حکم دے دیا۔ اس حکم سے حافظ کے لہجے کا رنگ و آہنگ جو شاہ ابو اسحق کے زمانے میں (یعنی دو سال پہلے) تھا عود کر آیا۔ انہوں نے رندوں اور مے پرستوں کے ساتھ شاہ شجاع کے اس طرز عمل کو سراہا۔ اب حافظ کے لہجے میں رندی و سرمستی کے مضامین زیادہ جوش و خروش کے ساتھ بیان ہونے لگے۔ لہجے میں بے باکی پیدا ہوگئی۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں :

المنۃ للہ کہ در میکدہ باز است   زاں رو کہ مرا بر در او روئے نیاز است[11]

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش   کہ دور شاہ شجاعست مے دلیر بنوش[12]

ہاتفے از گوشۂ میخانہ دوش   گفت: بخشند گنہ مے بنوش[13]

ان "خوش گوار" حالات اور "فرح بخش" و "کیف آور" ماحول میں بھی حافظ کے لئے تلخ نوائی کی ایک اور ناخوش گوار صورت موجود تھی۔ اس اجمال کی تفصیل و توضیح یہ ہے کہ حافظ کے ایک ہمعصر استاد عماد فقیہ کرمانی کو جیسا کہ حافظ کے بعض اشعار سے مستنبط ہوتا ہے، حافظ کی شہرت و مقبولیت سے خوشی نہیں ہوتی تھی۔ وہ بر بنائے حسد ان کے شعروں میں عیب جوئی کیا کرتے تھے۔ اپنے بعض اشعار میں حافظ نے شیخ کی حاسدانہ اور معاندانہ روش پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ اس بات کا اندازہ درج ذیل اشعار سے کیا جاسکتا ہے۔

حسد چہ میبری اے سست نظم بر حافظ   قبول خاطر و لطف سخن خداداد است[14]

ز شعر دلکش حافظ کسے بود آگاہ   کہ لطف طبع و سخن گفتن دری داند[15]

حافظ کے نزدیک شاعری کی ادائے دلبری "لطف طبع" اور "سخن گفتن دری" کے سلیقے سے عبارت ہے، فن فروشی اور لفظی بازی گری سے نہیں جن سے ان کا حاسد انہیں مرعوب اور زیر کرنا چاہتا تھا۔ حافظ فرماتے ہیں :

مدعی گو لغز و نکتہ بحافظ مفروش   کلک ما نیز زبانے و بیانے دارد[16]

شعر ذیل میں "مدعی" کی نام نہاد استادانہ حیثیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے بڑے وثوق

لہجے میں فرماتے ہیں:

ای کہ دم خواندی استاد گر بنگری بتحقیق — صنعت گریست اما طبع رواں ندارد[17]

گو حافظ نے صراحت کے ساتھ کسی کا نام نہیں لیا لیکن شعر بالا میں "استاد" کہہ کر قیاسات کے دروازے ضرور کھول دئے۔ صنعت گری اور طبع رواں سے محرومی کی بات حافظ کے معاصروں میں جتنی عماد فقیہ پر صادق آتی ہے کسی اور پر نہیں۔ میر حسین دوست سنبھلی نے ان کے بارے میں بڑی دلچسپ بات لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

گویند ہر کہ در خانقاہش می آمد اشعار — کہتے ہیں کہ جو کوئی ان کی خانقاہ میں آتا تھا
خود را براو عرض می کرد والتماس اصلاح — اسے وہ اپنے اشعار سناتے تھے اور اصلاح کی
می نمود لہذا ظرفہ سخنان او را اہالی کرمان — درخواست کرتے تھے، لہذا ان کا عجیب و
گفتہ اند کہ ہیچ عیب ندارد[18] — غریب کلام اہل کرمان نے کہا ہے جس میں کوئی عیب نہیں۔

یہ ایک طنزیہ عبارت ہے جس کا آخری جملہ بہت تلخ ہے۔

حافظ نے عماد فقیہ پر ایک اور کرارا وار کیا ہے۔ بعض تذکروں میں یہ روایت نظر آتی ہے کہ عماد فقیہ نے ایک بلی پال رکھی تھی اور اسے اس طرح سدھایا تھا کہ جب وہ نماز پڑھتے تھے تو بلی بھی قیام وقعود و سجود میں ان کی اقتدا کرتی تھی۔ اس بات کا علم پورے شہر کو تھا۔ شاہ شجاع تو "بلی کی نماز" کو تقریباً عماد فقیہ کے معجزے پر محمول کرتا اور ان کا بڑا معتقد تھا۔[19] اس کے برعکس حافظ اس بات کو موصوف کی عیاری اور تزویر سے تعبیر کرتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

صوفی نہاد دام و سر حقہ باز کرد — بنیاد مکر با فلک حقہ باز کرد[20]

صوفی (یعنی عماد فقیہ) کو "حقہ باز" کہنے کے بعد وہ ان پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ای کبک خوش خرام کجا میروی بایست — غرہ مشو کہ گربہ عابد نماز کرد[21]

عماد فقیہ کی تحقیر شاہ شجاع سے برداشت نہ ہوئی۔ وہ حافظ کا دشمن اور ان کے درپے آزار ہو گیا۔ بادشاہ خود بھی شعر کہتا تھا لیکن حافظ کی غزلوں کے آگے اس کی غزلیں بہت بے مزہ اور پھیکی ہوتی تھیں۔ خود بادشاہ کو بھی اس حقیقت کا علم تھا لیکن حافظ پر برتری جتانے اور ان کی غزلوں میں عیب نکالنے کی غرض سے اس نے ایک بار یہ اعتراض کیا تھا کہ ان کی غزل میں کئی پہلو ہوتے ہیں۔ وہ متلون ہوتی ہے، کسی واحد تحریک کی پیدا وار نہیں۔ ابھی تصوف پر کہہ رہے ہیں، ابھی رندانہ اور عشقیہ شعر کہنے لگے۔ ابھی متانت اور روحانیت کے عالم میں ہیں تو ذرا دیر میں غیر سنجیدہ اور نفسانی دنیا میں آ گئے یا اس سے بھی بدتر راہ لی۔ خواجہ نے ان اعتراضات کا جواب یہ دیا کہ ان سب باتوں کے باوجود انہی کی غزلیں زبان زد خلائق ہوتی ہیں۔[22]

ان حالات کے باوجود حافظ نے ہر جگہ شاہ شجاع کی ستائش ہی کی ہے۔ اس کی ہجو میں کوئی شعر نہیں کہا۔ شاید اس لئے کہ اس کی ظاہری و باطنی شخصیتیں یک رنگ تھیں۔ وہ ریا کار نہ تھا اور حافظ کو تزویر و ریا سے نفرت تھی اس لئے شاہ شجاع کے پیر و مرشد ہونے کے باوجود فقیہ کرمانی، حافظ کے طنز و تشنیع کے تیروں کا ہدف بنے۔

قاضی یزد کی مذمت | خواجہ کے دیوان میں دو شعر کا ایک قطعہ یزد کے قاضی کی مذمت میں ہے۔ یہ قطعہ "ملالت علما ہم ز علم بے عملست"[23] والے مضمون پر مشتمل ہے۔ فرماتے ہیں:

سرائے مدرسہ و بحث علم و طاق و رواق — چہ سود چوں دل دانا و چشم بینا نیست
سرائے قاضی یزد ارچہ منبع فضلست — خلاف نیست کہ علم نظر در آنجا نیست[24]

استاد مدرسے کی روح ہوتا ہے۔ اسی کی لیاقت اور قابلیت پر مدرسے کی عظمت و شہرت کا انحصار ہوتا ہے۔ اگر استاد خود "علم نظر" اور "علم خبر" سے محروم ہو تو مدرسے میں ہونے والے علمی بحث و مباحث سے کیا فائدہ؟ اس لحاظ سے یزد کے قاضی کا گھر علم و فضل کا منبع تو ہے لیکن اس بات سے کسی کو اختلاف

نہیں ہو سکتا ہے کہ وہاں علم نظر کا فقدان ہے۔

عمومی نوعیت کی ہجویں اب تک جن ہجویہ اور طنزیہ اشعار کا جائزہ لیا گیا ہے، ان میں حافظ کے مطعونین کا ذکر ان کے ناموں یا عہدوں کی صراحت کے ساتھ کیا گیا ہے، لیکن بہت سے اشعار ایسے ہیں جو زاہد، عابد، شیخ، صوفی، حافظ، واعظ، قاضی وغیرہ کی مذمت میں کہے گئے ہیں۔ یہ اشعار تلخ نوائی کی شرط اور معیار پر پورے اترتے ہیں۔ ان پر بظاہر روایتی طنزیہ اشعار ہونے کا گمان گزرتا ہے لیکن قرائن پتہ دیتے ہیں کہ ان کا حقیقت سے تعلق ضرور ہے۔ علاوہ بریں تزویر و ریا اور کردار و شخصیت کی دورنگی و عدم ہم آہنگی کی شالوں سے انسانی تاریخ کا کوئی دور خالی نہیں رہا ہے۔ حافظ کے دور حیات میں، مشہور مستشرق ڈاکٹر ای۔ جی۔ براؤن کے بقول، "عیش دوست شیرازیوں میں شراب خوری اور دوسری بدچلنیاں عام تھیں[25] ان کے انسداد کے لئے محتسب، قاضی اور دیگر حکام کا تقرر عمل میں آتا تھا۔ انھیں میں سے بعض کا مزور اور ریا کار ہونا بعید از قیاس تو نہیں۔ حافظ کے مطعون ایسے ہی "دین دار" ہیں۔ وہ دل میں شریعت کے محافظ بنے پھرتے ہیں اور رات کو بقول حافظ "کار دیگری می کنند" اس لئے:

مے خور کہ شیخ و حافظ و مفتی و محتسب	چوں نیک بنگری ہمہ تزویر می کنند[26]

سطور ذیل میں واعظ، زاہد، صوفی اور شیخ کے بارے میں حافظ کے طنز بھرے بعض اشعار کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

واعظ: حافظ کردار کی یک رنگی (خواہ وہ منفی ہی کیوں نہ ہو) کے مداح اور شخصیت کی دورنگی کے زبردست مخالف تھے۔ ان کی ساری شاعرانہ عمر گندم نما جو فروشوں کی اصلیت پر سے پردہ اٹھانے میں گزری ہے۔ انہوں نے اپنے اس خیال کا کہ واعظ ہو کہ زاہد، صوفی ہو کہ شیخ اگر ان کے اعمال و کردار کا جائزہ لیا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ سب تزویر کر رہے ہیں[27] لہذا وہ

ریاکار اور مزور علماء اور صوفیہ سے سخت بدظن تھے اور ان پر طنز و تشنیع کے تیر برسانے سے چوکتے نہیں تھے۔ واعظوں کی مذمت میں ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے:

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند	چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند[28]

ایک شعر خبر دیتا ہے کہ حافظ کو واعظ کی "تزویر و ریا" کا تجربہ ہے۔ ایک بار تو وہ اس کے دام فریب میں آگئے تھے لیکن اب دوسری بار وہ محتاط ہیں اور اس کی بیہودہ باتوں میں آنے والے نہیں:

دور شو از برم اے واعظ و بیہودہ مگوے	من نہ آنم کہ دگر گوش بتزویر کنم[29]

حافظ کے خیال میں واعظ اپنی گمراہ کن باتوں اور حرکتوں کے باعث دائرہ اسلام سے خارج ہو چکا ہے۔ اسلام میں اس کی واپسی کی ممکنہ صورت یہی ہے کہ وہ سالوس و ریا سے توبہ کر لے مگر اس کی یہ عادتیں اتنی پختہ ہو چکی ہیں کہ انہیں ترک کرنا اب اس کے لئے آسان نہیں رہا۔

گرچہ بر واعظ شہر ایں سخن آساں نشود	تا ریا ورزد و سالوس، مسلماں نشود[30]

زاہد: زاہد "عالی مقام" بھی زرق و ریا میں کسی سے کم نہیں۔ ان کے زہد کی حقیقت ہمارے شاعر سے پوشیدہ نہیں۔ چونکہ وہ زاہد سے زیادہ "زہد فروش" ہیں، اس لئے حافظ بادہ نوش کو اس کی بے ریائی کے سبب ان پر فوقیت دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

بادہ نوشے کہ در و روے و ریائے نبود	بہتر از زہد فروشے کہ در و روئے و ریاست[31]

اسی لئے حافظ فرماتے ہیں:

مے خور کہ صد گناہ ز اغیار در حجاب	بہتر ز طاعتے کہ ز روے و ریا کنند[32]

"زاہد عالی مقام" پر حافظ کے طنز کی چند اور مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

راز درون پردہ ز رندان مست پرس	کیں حال نیست زاہد عالی مقام را[33]

نہ بہفت آب کہ رنگش بصد آتش نرود	آنچہ با خرقہ زاہد مے انگوری کرد[34]

اسی لئے حافظ کہتے ہیں:

من حالت زاہد را باخلق نخواہم گفت   ایں قصہ اگر گویم باچنگ و رباب اولیٰ [۳۵]

صوفی: ریاکار صوفی کی مذمت میں بھی حافظ نے چند تند و ترش اشعار کہے ہیں۔ یہ اشعار ان کے ان رسمی نوعیت کے اشعار سے یکسر مختلف ہیں جو انہوں نے اپنے کلام میں لطف و شوخی پیدا کرنے کی غرض سے کہے ہیں۔ اشعار کے بعض الفاظ مثلاً "دجال فعل ملحد شکل" اور "صوفی شہر" صاف غمازی کرتے ہیں کہ یہ افراد فرضی اور قیاسی نہیں رہے ہوں گے۔ حقیقت میں ان کا وجود رہا ہوگا۔ اشعار میں حافظ کا لہجہ بڑا غضب ناک ہے۔ فرماتے ہیں:

کجاست صوفی دجال فعل ملحد شکل   بگو بسوز کہ مہدی دیں پناہ رسید [۳۶]

تصوف میں فقر و فاقہ کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ سچا صوفی جسم کو کمزور کرکے روح کو بالیدگی عطا کرتا ہے۔ وہ جو کچھ کھاتا ہے اس کے ہر طرح سے غیر مشتبہ ہونے کا اطمینان کر لیتا ہے اور اتنا ہی کھاتا ہے جتنا سد رمق کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ حافظ نے ایک ایسے صوفی کا ذکر ایک شعر میں کیا ہے جو نہایت خوش خوراک تھے اور اسی لئے روز بروز زیادہ لحیم و شحیم ہوتے جارہے تھے۔ حافظ ان کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

صوفی شہر بیں کہ چوں لقمہ شبہہ میخورد   پاردمش دراز باد ایں حیوان خوش علف [۳۷]

"پاردم"، "حیوان" اور "خوش علف" سے صاف مترشح ہے کہ حافظ نے اس صوفی کو گھوڑے اور خچر جیسے جانور سے تشبیہ دی ہے۔ ایک شعر میں فرماتے ہیں:

خیز تا خرقہ صوفی بخرابات بریم   شطح و طامات بباز ار خرافات بریم [۳۸]

ایک شعر میں ارشاد ہوتا ہے:

بوئے یکرنگی ازیں نقش نمی آید خیز   دلق آلودۂ صوفی بمے ناب بشوئے [۳۹]

شیخ: حافظ کے طنزیہ اشعار میں ایسے اشعار کی خاصی تعداد ہے جن میں ایک تیر سے کئی شکار کئے گئے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار جو ایک ہی غزل سے ماخوذ ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

در عہد پادشاہ خطا بخش جرم پوش   حافظ قرابہ کش شد و مفتی پیالہ نوش

صوفی ز کنج صومعہ با پائے خم نشست   تا دید محتسب کہ سبو می کشد بدوش

احوال شیخ و قاضی و شرب الیہود شاں   کردم سوال صبحدم از پیر مے فروش

گفتا نگفتنیست سخن گر چہ محرمی   درکش زبان و پردہ نگہ دار و مے بنوش [۴۰]

حافظ نے کئی اشعار میں شیخ کی تزویر کا ذکر حافظ، مفتی، محتسب، صوفی وغیرہ کے ساتھ کیا ہے۔ یہاں چند ایسے شعر پیش کئے جاتے ہیں جہاں حافظ کے تیر ملامت کا ہدف صرف شیخ ہے فرماتے ہیں:

مرید پیر مغانم ز من مرنج اے شیخ   چرا کہ وعدہ تو کردی و او بجا آورد [۴۱]

یہ "نقد و نسیہ" والا مضمون ہے۔ شیخ تو اپنے لئے "نقد" کا قائل ہے لیکن شاعر کو نسیہ یعنی شراب طہور کے وعدے پر ٹرخا رہا ہے۔ شیخ اپنی روٹی (رزق)، کے حلال ہونے کا دعویٰ بہ کرات و مرات کرتا ہے۔ حافظ کو اس کی "نان حلال" کی حقیقت کا علم ہے۔ لہٰذا فرماتے ہیں:

ترسم کہ صرفۂ نبرد روز باز خواست   نان حلال شیخ ز آب حرام ما [۴۲]

اسی لب و لہجہ کا حامل ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے:

ترسم کہ روز حشر عناں در عناں رود   تسبیح شیخ و خرقۂ رند شرابخوار [۴۳]

حافظ: یہ لفظ خواجہ کی شخصیت کے دو پہلوؤں۔ ان کے شاعرانہ تخلص اور حفظ قرآن کی سعادت۔ کو آشکار کرتا ہے۔ وہ اپنی ان دونوں ہی حیثیتوں میں نہایت صاف گو، بے باک اور شدید ریا کے سخت خلاف تھے اور قرآن جیسے مقدس آسمانی صحیفے کو دنیوی مفادات کے حصول کے لئے رزق و تزویر کا وسیلہ بنایا جانا ان کے لئے بے حد افسوس ناک تھا۔ ان کے بعض اشعار سے یہ حقیقت

بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ان کے عہدِ حیات میں بعض مردہ ضمیر، مفاد پرست اور خود کام لوگ قرآن کو "دامِ تزویر" بنانے کی قبیح حرکت کرتے تھے۔ یہ شعر اس بات کا بین ثبوت ہے:

حافظا مے خور و رندی کن و خوش باش ولے   دامِ تزویر مکن چوں دگراں قرآں را[۴۵]

اس شعر میں الفاظ "چوں دگراں" (یعنی دوسروں کی طرح) بطور خاص توجہ طلب ہیں اور اس بات کے ثبوت ہیں کہ حافظ کے زمانے میں "دوسرے" حافظ یا قرآن خواں قرآن کو دامِ تزویر بنانے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ ایک دوسرے شعر میں اسی بات کا اعادہ کرتے ہوئے بظاہر اپنے آپ کو لیکن درحقیقت دوسروں کو زرق و شید سے باز آنے کی نصیحت کرتے ہیں:

حافظ بحق قرآں کز شید و زرق باز آئے   باشد کہ گوئے عیشے در این جہاں تواں زد[۴۶]

ان اشعار کی روشنی میں صورتِ حالات کی دگرگونی کو قیاس کیا جا سکتا ہے:

ز خانقاہ بمیخانہ میرود حافظ   مگر ز مستی زہد و ریا بہوش آمد[۴۷]

حافظ گرت بمجلس او راہ میدہند   مے نوش و ترک زرق ز بہر خدا بگو[۴۸]

حافظ اس صورتِ حال سے سخت بیزار اور دل برداشتہ تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ شید و ریا کی دکان کو فروغ حاصل ہو۔ اگر امعانِ نظر سے ان کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو صاف طور پر نظر آتا ہے کہ وہ ساری عمر شید و ریا کے خلاف قلمی جہاد کرتے رہے۔ درج ذیل اشعار اس زمانے کے ہیں جب امیر مبارز الدین نے میخانوں کے دروازے مقفل کر دا دئے تھے۔

بود آیا کہ در میکدہا بگشایند   گرہ از کار فروبستۂ ما بگشایند

در میخانہ ببستند خدایا مپسند   کہ در خانۂ تزویر و ریا بگشایند[۴۹]

کیوں کہ خانۂ تزویر و ریا میں ایسی شخصیتیں تیار ہوتی ہیں جن کے ظاہر و باطن میں کوئی مطابقت نہیں ہوتی، ان کے کردار و گفتار میں یکسانگی کے فقدان ہی نے حافظ کو ان کی مذمت کی تحریک دی۔

بقول خود:

غلامِ ہمت دردی کشان یک رنگم   نہ آں گروہ کہ ازرق لباس و دل سیہند[۵۰]

حواشی

[۱] مشہور قول یہ ہے:

در شعر سہ تن پیمبرانند   ہر چند کہ لا نبی بعدی

ابیات و قصیدہ و غزل را   فردوسی و انوری و سعدی

[۲] اشارہ ہے حافظ کے اس شعر کی طرف:

مے خور کہ شیخ و حافظ و مفتی و محتسب   چوں نیک بنگری ہمہ تزویر می کنند

[۳] تاریخ ادبیات ایران بعہد مغولاں، ای، جی، براؤن، ترجمہ از داؤد مہیر: ص ۳۹۰، [۴] شعر یہ ہے:

دریائے اخضر فلک و کشتی ہلال   ہستند غرق نعمت حاجی قوام ما

[۵] دیوان خواجہ شمس الدین محمد حافظ، از روئے نسخۂ تصحیح شدۂ محمد قزوینی و دکتر قاسم غنی: ص: ۷، [۶] تاریخ ادبیات ایران بعہد مغولان: ص ۴۳۲ [۷] حافظ نے اپنے اس مربی اور سرپرست کے مرثیے میں چار دل سوز غزلیں لکھی ہیں ان میں سے ایک کے دو شعر درج ذیل ہیں:

راستی خاتم فیروزۂ بو اسحٰقی   خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

دی آں قہقہۂ کبک خراماں حافظ   کہ سر پنجۂ شاہین قضا غافل بود (ص ۱۶۱)

[۸] دیوان حافظ، از روئے نسخۂ تصحیح شدہ محمد قزوینی و دکتر قاسم غنی: ص: ۱۴۳ [۹] ایضاً: ص ۹۹ [۱۰] ایضاً: ص ۱۸۷ [۱۱] ایضاً: ص ۱۵ [۱۲] ایضاً: ص ۱۸۹ [۱۳] ایضاً: ص ۱۹۳ [۱۴] ایضاً: ص ۲۴ [۱۵] ایضاً: ص ۱۵۳ [۱۶] ایضاً: ص ۱۲۹ [۱۷] ایضاً: ص ۹۰ [۱۸] تذکرۂ حسینی، میر حسین دوست سنبھلی، مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۷۵ء/۱۲۹۲ھ: ص ۲۰۷ [۱۹] ایضاً [۲۰] دیوان حافظ، از روئے نسخۂ قزوینی: ص ۱۳۳ [۲۱] ایضاً: ص ۱۳۳

۲۳ تاریخ ادبیات ایران بعہد مغولاں: ص ۳۰۲ ۲۴ دیوان حافظ، ازروئے نسخۂ قزوینی: ص ۲۶ ۲۵ ایضاً: ص ۴۴ ۲۵ تاریخ ادبیات ایران بعہد مغولاں: ص ۲۴۱ ۲۶ دیوان حافظ، ازروئے نسخۂ قزوینی: ص ۹۹ ۲۷ ایضاً ص ۹۹ ۲۸ ایضاً: ص ۱۵۵ ۲۹ ایضاً: ص ۱۳۳ ۳۰ ایضاً: ص ۱۴۱ ۳۱ ایضاً: ص ۴۰ ۳۲ ایضاً: ص ۷۰ ۳۳ ایضاً: ص ۹ ۳۴ ایضاً: ص ۱۰۹ ۳۵ ایضاً: ص ۲۹۷ ۳۶ ایضاً: ص ۸۶ ۳۷ ایضاً: ص ۱۹۸ ۳۸ ایضاً: ص ۲۲۱ ۳۹ ایضاً: ص ۳۱۴ ۴۰ شرب الیہود یعنی یہودیوں کی شراب نوشی۔ شراب کی حرمت کے اعلان کے ساتھ یہودیوں نے بھی علانیہ شراب نوشی ترک کردی تھی۔ وہ مسلمانوں کے ڈر سے چھپ چھپ کر اور تھوڑی تھوڑی پینے لگے تھے تاکہ ان کی مستی ظاہر نہ ہو (ترجمہ از بہار عجم: ص ۱۵۹) اب شرب الیہود چھپ کر شراب پینے کو کہتے ہیں ۴۱ دیوان حافظ، ازروئے نسخۂ قزوینی: ص ۱۸۷ ۴۲ ایضاً: ص ۴۹ ۴۳ ایضاً: ص ۷ ۴۴ ایضاً: ص ۱۷۰ ۴۵ ایضاً: ص ۶ ۴۶ ایضاً: ص ۱۱۶ ۴۷ ایضاً: ص ۱۳۲ ۴۸ ایضاً: ص ۲۷۱ ۴۹ ایضاً: ص ۸۳-۸۴ ۵۰ ایضاً: ص ۱۳۰۔

علامہ اقبال کا برقی علاج

بھوپال جانے کا مشورہ کس نے دیا تھا؟

از پروفیسر اکبر رحمانی ٭

۱۹۳۴ء کی ابتدا میں علامہ اقبال کو گلے کے عارضہ کی شکایات پیدا ہوگئی تھی۔ آگے چل کر انہیں کلام کرنے میں تکلیف ہونے لگی۔ گلے کا یہ عارضہ کس طرح ہوا؟ اس کی تفصیل ڈاکٹر جاوید اقبال نے علامہ کی سوانح 'زندہ رود' میں بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"۱۹۳۴ء میں عیدالفطر ۱۰ جنوری کو آئی۔ اقبال، چودھری محمد حسین، علی بخش اور راقم کے ساتھ موٹر کار میں بیٹھ کر بمطابق معمول بادشاہی مسجد میں نماز ادا کرنے کی غرض سے گئے۔ اس روز خوب سردی تھی اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اقبال نے شلوار اور اچکن پہن رکھی تھی۔ سر پر ٹوپی تھی لیکن پاؤں میں موزے شاید باریک تھے۔ مسجد کے یخ بستہ فرش پر جوتوں کے بغیر چلنے سے انہیں سردی سی محسوس ہوئی۔ گھر واپس پہنچ کر سویوں پر دہی ڈال کر کھایا۔ اگلے روز انفلوئنزا ہوگیا جو مختلف دوائیں کھانے کے باوجود دو تین ہفتوں تک جاری رہا۔ پھر ایک شب تین چار گھنٹے کھانسی کا دورہ پڑا۔ علاج کیا گیا۔ چند دنوں بعد انفلوئنزا اور کھانسی کی شکایت تو دور ہوگئی، لیکن گلا بیٹھ گیا اور ایسا بیٹھا کہ ...... کھل کر یا بلند آواز سے بول نہ سکتے تھے۔[1]"

[1] زندہ رود۔ ڈاکٹر جاوید اقبال۔ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور ص ۵۲۶۔

٭ اڈیٹر ماہنامہ آموزگار، ۲۷ بھوانی پیٹھ، جلگاؤں، مہاراشٹر۔

علامہ نے اپنی اس بیماری کا تذکرہ چند دوستوں کے نام خطوط میں بھی کیا، چنانچہ سب سے پہلے سید نذیر نیازی کو مطلع کیا:

"... میں کئی دنوں سے علیل ہوں۔ انفلوئنزا ہو گیا تھا۔ اب صرف گلے کی شکایت باقی ہے جو ابھی تک صاف نہیں ہوا۔" (مکتوب اقبال بنام نیازی مرقوم ۲۷ فروری ۳۴ء)

لمعہ حیدرآبادی نے ڈاکٹری کا کورس اگرچہ والد کے ناگہانی انتقال کے بعد پیدا ہوئے جائیداد کے تنازعہ اور دیگر گھریلو پریشانیوں کی وجہ سے مکمل نہ کیا تھا لیکن وہ ایک اچھے طبیب اور ڈاکٹر تھے۔ نیز ممبئی کے مشہور ڈاکٹروں سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ یقیناً علامہ نے لمعہ کو بھی اپنی بیماری سے مطلع کیا ہوگا۔ کیونکہ بعد کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال ان کو اپنی صحت اور بیماریوں سے آگاہ کرتے تھے۔ ایک خط (محررہ ۱۹ اپریل ۳۴ء) میں اقبال اپنی بیماری کے متعلق ان کو لکھتے ہیں:

"مجھے قریباً دو ڈھائی ماہ سے ACUTE LARYNGITIS کی شکایت ہے جس کی وجہ سے بولنے یا عام طور پر کلام کرنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ بہت علاج کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔"[1]

لمعہ کو جب اس بیماری کا علم ہوا تو وہ علامہ کی صحت کے بارے میں فکر مند ہو گئے ہوں گے اور انہوں نے بمبئی، حیدرآباد کے ممتاز ڈاکٹروں سے مشورہ بھی کیا ہوگا۔ انہیں اس بات کا بھی پتہ چلا ہوگا کہ گلے کے اس عارضہ کو 'برقی علاج' کے ذریعہ سے دور کیا جا سکتا ہے۔ انہیں یہ بات بھی معلوم ہوئی ہوگی کہ بھوپال کے حمیدیہ اسپتال میں برقی علاج کی سہولت ہے۔ یہ سب واقفیت حاصل کرنے کے بعد لمعہ نے فوراً علامہ اقبال کو ایک خط لکھا اور انہیں برقی علاج کے لئے بھوپال جانے کا مشورہ دیا۔

[1] اقبال نامہ اول ص ۲۷۸۔ مذکورہ خط سے پہلے جو خط تحریر کیا گیا ہے وہ ۲۰ جولائی ۳۳ء کا ہے۔ لمعہ اور اقبال کے دوستانہ تعلقات کے پیش نظر یہ بات قرین قیاس ہے کہ پچھلے ۹ ماہ کے دوران علامہ نے ضرور لمعہ کو اپنی بیماری سے مطلع کیا ہوگا اور ان سے طبی مشورہ مانگا ہوگا۔

اس خط کے جواب میں علامہ اقبال نے لمعہ کے مفید طبی مشورے کا شکریہ ادا کیا اور لکھا "انشاء اللہ آپ کے حسب خواہش ضرور بھوپال جا کر بجلی کے ذریعہ علاج کراؤں گا۔" یہ خط ۱۱ مارچ ۱۹۳۴ء[1] کا تحریر کردہ ہے۔ مکاتیب اقبال میں اس خط سے پہلے ایسا کوئی خط نہیں ملتا جس میں گلے کے عارضہ کو دور کرنے کے لئے برقی علاج کا مشورہ دیا گیا ہو اور اس کے لئے بھوپال جانے کے لئے ہدایت کی گئی ہو۔

اب تک یہ دعویٰ کیا جاتا رہا ہے کہ سر راس مسعود نے علامہ اقبال کو برقی علاج کے لئے بھوپال آنے کا مشورہ دیا تھا۔ عبدالمجید سالک رقم طراز ہیں:

"حضرت علامہ کو سرسید کے پوتے ڈاکٹر سر راس مسعود سے بڑی الفت تھی اور وہ بھی ان پر جان چھڑکتے تھے۔ انہوں نے تجویز کیا کہ علامہ بھوپال تشریف لا کر بجلی کا علاج کرائیں جس کا بہترین انتظام بھوپال میں ہے۔"[2]

محمد طاہر فاروقی لکھتے ہیں:

"(راس مسعود مرحوم کے مشورے اور اصرار سے آپ (اقبال) بجلی کے علاج کے لئے آخر جنوری ۱۹۳۵ء میں بھوپال گئے۔"[3]

پروفیسر جگن ناتھ آزاد فرماتے ہیں:

"سرسید مرحوم کے پوتے اور بھوپال کے وزیر تعلیم سر راس مسعود اقبال کے ساتھ عشق کی حد تک محبت کرتے تھے۔ انہوں نے یہ پیش کش کی کہ اقبال بھوپال آئیں اور یہاں بجلی کا علاج کرائیں۔

[1] اقبال نامہ حصہ اول میں اس خط کی تاریخ ۱۱ مئی ۱۹۳۵ء درج ہے۔ صابر کلوروی نے اپنے مضمون "مکاتیب اقبال کے ماخذ۔ ایک تحقیقی جائزہ" (اقبال ریویو لاہور۔ جولائی ۱۹۸۲ء، ص ۵۰) میں اس خط کی صحیح تاریخ ۱۱ مئی ۱۹۳۴ء متعین کی ہے۔ راقم الحروف کو جو اصل خط ملا ہے اس میں صحیح تاریخ ۱۱ مارچ ۱۹۳۴ء درج ہے [2] ذکر اقبال ص ۱۹۴ [3] سیرت اقبال ص ۹۲۔

چنانچہ اقبال جنوری ۱۹۳۵ء میں بھوپال تشریف لے گئے۔[1]
سید نذیر نیازی کا بھی بیان ہے کہ جنوری ۱۹۳۵ء میں سر راس مسعود مرحوم کی محبت انہیں بھوپال کھینچ لائی تھی۔[2]

ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

"نومبر ۱۹۳۴ء سے سر راس مسعود بھوپال میں وزیر تعلیم وصحت وامور عامہ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے گلے کی تکلیف کے بارے میں اقبال کو بھوپال آکر بجلی کا علاج کرانے کی دعوت دی۔ اقبال کے بعض دیگر احباب نے بھی انہیں یہی مشورہ دیا تھا۔ بھوپال کے حمیدیہ اسپتال میں اس وقت بجلی کے علاج سے متعلق جدید ترین مشینیں نصب کی گئی تھیں۔ بالآخر سر راس مسعود کے اصرار پر اقبال نے بھوپال جاکر بجلی کا علاج کرانے کا ارادہ کر ہی لیا۔"[3]

عبدالقوی دسنوی نے بھی یہی سب باتیں دہرائی ہیں اور کسی بات کا اضافہ نہیں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"علامہ اقبال سے سر راس مسعود کے تعلقات اتنے گہرے اور خلوص کی بنیاد پر تھے کہ جب انہیں علامہ کی بیماری اور پھر علاج سے خاطر خواہ فائدہ نہ ہونے کی خبر ملی تو وہ بے چین ہوگئے۔ چنانچہ انہوں نے علامہ کو بھوپال آکر علاج کرانے کا مشورہ دیا۔[4] علامہ اس بات پر بھوپال میں علاج کے لئے تیار ہوگئے کہ اس کے ساتھ حکیم نابینا کا علاج بھی جاری رکھیں۔"[5]

---

۱ محمد اقبال۔ ایک ادبی سوانح حیات۔ ص ۱۲۲ ۲ سہ ماہی اردو اقبال نمبر ۱۹۷۷ء ص ۲۹۵/ اقبال۔ ایک مطالعہ ص ۱۱۸ ۳ زندہ رود۔ ص ۴۶ ۴ عبدالقوی دسنوی نے بھی ایک خط میں لکھا ہے "اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ علاج کے لئے بھوپال کا سفر انہوں نے سر راس مسعود کے مشورہ سے کیا تھا میری تحقیق یہی ہے۔" (ہماری زبان دہلی ۸؍ اپریل ۱۹۸۹ء) ۵ اقبال اور دارالاقبال بھوپال۔ ص ۳۷۔

غرض اقبال کے بیشتر سوانح نگاروں نے یہی دعویٰ کیا ہے علامہ کو برقی علاج کے لئے بھوپال آنے کا مشورہ سب سے پہلے سر راس مسعود نے دیا تھا، مگر آپ نے دیکھا کہ اس دعوے کی تائید میں کوئی ٹھوس ثبوت نہیں پیش کیا گیا۔ سر راس مسعود کا اقبال کے نام کوئی ایسا خط اب تک میری نظروں سے نہیں گزرا جس میں انہوں نے اقبال کو برقی علاج کے لئے بھوپال آنے کا مشورہ دیا ہو۔ نہ سر راس مسعود کے نام اقبال کا کوئی ایسا خط شایع ہوا ہے، جس میں انہوں نے مشورے کے لئے سر راس مسعود کا شکریہ ادا کیا ہو۔ اس لئے ان سوانح نگاروں کے دعوے کو بلا ثبوت تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

راقم الحروف نے اس بات کا دعویٰ ضرور کیا ہے کہ علامہ اقبال کو برقی علاج کے لئے بھوپال جانے کا مشورہ سب سے پہلے سر راس مسعود نے نہیں لمعہ حیدرآبادی نے دیا تھا اور علامہ نے اس مشورے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس پر ضرور عمل کریں گے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں راقم نے مکتوب اقبال بنام لمعہ (محررہ یکم دسمبر ۱۹۳۴ء) کو پیش کیا تھا جو بھوپال جانے سے دو ماہ قبل تحریر کیا گیا تھا۔[1] لیکن عبدالقوی دسنوی میرے دعوے کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔[2] انہوں نے یکم دسمبر ۱۹۳۴ء کے خط کو قطعی نظر انداز کر دیا ہے اور بطور ثبوت لمعہ کے نام ۱۱؍ مئی ۱۹۳۵ء کا خط بحث میں لاکر یہ استدلال کیا ہے کہ:

"اقبال ۳۱؍ جنوری ۱۹۳۵ء سے ۸؍ مارچ ۱۹۳۵ء تک بھوپال رہ کر علاج کرا چکے تھے پھر ۱۱؍ مئی ۱۹۳۵ء کو اقبال کو لمعہ کا بھوپال میں علاج کے لئے مشورہ کیا معنی؟"[3]

پہلی بات تو یہ کہ میں اپنے دعوے کے ثبوت میں ۱۱؍ مئی ۱۹۳۵ء کے خط کو بحث میں نہیں لایا تھا۔

---

۱ تحقیقات وتاثرات۔ اکبر رحمانی۔ ۱۹۸۷ء، ص ۸۳ ۲ و ۳ ہفتہ وار ہماری زبان دہلی۔ ۸؍ اپریل ۱۹۸۹ء ص ۲۔

یہ عبدالقوی دسنوی کی ذہنی اختراع ہے کہ لمعہ کو جھوٹا ثابت کرنے کے لئے انہوں نے قصداً یکم دسمبر ۱۹۳۴ء کے خط کو نظر انداز کیا۔ جو ثبوت (یعنی لمعہ کے نام ۱۱ مئی ۱۹۳۵ء کا خط) میں نے پیش ہی نہیں کیا اسے میرے نام منسوب کرنا سراسر زیادتی ہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ "اقبال کے کرم فرما" ماسٹر اختر نے اپنے کرم فرما عبدالقوی دسنوی کی دلیل کو مسترد کرتے ہوئے میرے دعوے کی حقانیت کو تسلیم کیا اور عبدالقوی دسنوی سے دانستہ سرزد ہوئی غلطی کی نشاندہی کی۔ ماسٹر اختر لکھتے ہیں:

"جناب عبدالقوی دسنوی صاحب نے اکبر رحمانی صاحب کے اس دعوے کو مسترد کرنے کے لئے مورخہ ۸ اپریل ۱۹۸۹ء کے ہفتہ وار 'ہماری زبان' میں مندرجہ بالا خط کو جو علامہ اقبال کے بغرض علاج پہلی بار بھوپال آنے سے دو ماہ پہلے کا ہے اور جس میں علامہ اقبال کو بھوپال میں بجلی کے علاج کا مشورہ دیا گیا ہے کلی طور پر نظر انداز کر کے لمعہ کے نام مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۳۵ء کے خط کو زیر بحث لیا ہے۔ حالانکہ اس خط میں بھی بجلی کے علاج کا مشورہ دیا گیا ہے لیکن اس ضمن میں بصد احترام یہ عرض ہے کہ متذکرہ بالا خط وہ BARRTER ہے جس کو عبور کئے بغیر عبدالقوی دسنوی صاحب تو کیا کوئی بھی اکبر رحمانی صاحب کے دعوے کی نفی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ عبدالقوی دسنوی صاحب کی یہ دلیل: "حالانکہ اقبال ۳۱ جنوری ۱۹۳۵ء سے ۷ مارچ ۱۹۳۵ء تک بھوپال رہ کر علاج کرا چکے تھے[1]۔ پھر ۱۱ مئی ۱۹۳۵ء کو اقبال کو لمعہ کا بھوپال میں علاج کے لئے مشورہ کیا معنی؟" اکبر رحمانی صاحب کے موقف کو مسترد کرنے کے بجائے اسے تقویت پہنچاتی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا جب یکم دسمبر ۱۹۳۴ء کے مندرجہ بالا خط میں علامہ کے علاج کی غرض سے بھوپال آنے سے دو ماہ پہلے اس علاج کا مشورہ

[1] ماسٹر اختر نے علامہ اقبال کے بھوپال میں بغرض برقی علاج قیام کی تاریخ ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء سے ۸ مارچ ۱۹۳۵ء بیان کی ہے جو درست نہیں ہے۔ صہبا لکھنوی نے "اقبال اور بھوپال" میں صحیح تاریخ لکھی ہے جو ۳۱ جنوری ۱۹۳۵ء تا ۷ مارچ ۱۹۳۵ء ہے۔ (ص ۸۸، ۸۹)

دیا جانا ثابت ہوتا ہے تو پھر عبدالقوی دسنوی صاحب کے سامنے اکبر رحمانی صاحب کے موقف کو قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس میں (عبدالقوی دسنوی)" علاج پہلے اور مشورہ بعد میں" کو اپنے تمام دلائل کی بنیاد بنا چکے ہیں"[1]

ممتاز ماہرین اقبالیات صہبا لکھنوی اور پروفیسر صابر کلوروی کے بیانات بھی میرے دعوے کی تائید کرتے ہیں۔ صہبا لکھنوی فرماتے ہیں:

"۱۹۳۴ء میں حکیم نابینا کے علاج سے اقبال کی عام صحت تو بحال ہو گئی لیکن گلے کی تکلیف میں کوئی فرق نہ آیا۔ اسی عرصے میں ڈاکٹر لمعہ اور کئی احباب نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ بھوپال جا کر بجلی کا علاج کرائیں"[2]

پروفیسر صابر کلوروی لکھتے ہیں:

"۱۹۳۴ء میں ان کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ حکیم نابینا کے علاج سے ان کی عام جسمانی صحت تو اچھی ہو گئی مگر گلے کی شکایت بدستور موجود رہی۔ اسی دوران علامہ اقبال کے ایک ملنے والے ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ نے انہیں بھوپال کے حمیدیہ اسپتال (پرنس آف ویلز اسپتال) میں بجلی کا علاج کرانے کا مشورہ دیا تھا"[3]

قابل ذکر بات یہ کہ سر راس مسعود نومبر ۱۹۳۴ء میں بھوپال آئے تھے[4]۔ ان کے نام سب سے پہلا خط جو دریافت ہوا ہے وہ ۱۴ جنوری ۱۹۳۴ء کا تحریر کردہ ہے[5] اور دوسرا خط ۲ جون ۱۹۳۴ء کا ہے۔ اس کے بعد ۱۹۳۴ء کے اختتام تک اقبال کا کوئی خط سر راس مسعود کے نام نہیں ہے۔ جہاں تک ان دو خطوں کے موضوعات کا تعلق ہے ان میں علامہ اقبال نے اپنی بیماری کا ذکر کیا ہے نہ برقی علاج

[1] اقبال کے کرم فرما۔ ص ۷۰، [2] اقبال اور بھوپال۔ ص ۸۹، [3] داستانِ اقبال ص ۷۶، [4] اقبال اور بھوپال۔ ص ۸۹ [5] روحِ مکاتیب اقبال، ص ۴۸۷۔

کا مشورہ دینے پر سر راس مسعود کا شکریہ، صرف لمعہ کے نام دو خطوط ایسے ملتے ہیں جن میں علامہ اقبال نے برقی علاج کے لئے بھوپال جانے کا مشورہ دینے پر لمعہ حیدرآبادی کا شکریہ ادا کیا ہے اور وعدہ فرمایا کہ وہ ضرور بھوپال جاکر بجلی سے علاج کرائیں گے۔

لمعہ کے نام اقبال کے جو دو خطوط ہیں ان میں سے ایک یکم دسمبر ۱۹۳۴ء کا تحریر کردہ ہے (جسے عبدالقوی دسنوی صاحب نے کلی طور پر نظر انداز کر دیا ہے) اور دوسرا ۱۱ مئی ۱۹۳۵ء کا ہے۔ اس خط کو بحث میں لاکر دسنوی صاحب نے غلط استدلال کیا ہے۔ وہ، ماسٹر اختر اور ان کے ہم نواؤں کو اس حقیقت کا علم نہیں کہ مذکورہ خط پر جو تاریخ و سن ہے وہ سراسر غلط ہے محقق کا انصاف پسند اور غیر جانب دار ہونا سچائی کی بازیافت کے لئے کتنا ضروری ہے۔

اس خط پر جو سوال عبدالقوی دسنوی صاحب نے کیا اسی پر جب منصف مزاج اور غیر جانبدار محقق پروفیسر صابر کلوروی نے مثبت انداز میں غور و فکر کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ کاتب یا ناقل سے تاریخ لکھنے میں سہو ہوا ہے۔ چنانچہ انہوں نے داخلی شہادتوں کی مدد سے اس کی صحیح تاریخ ۱۱ مئی ۱۹۳۴ء متعین کی ہے[1] اگرچہ اس کا سن درست ہے۔ لیکن تاریخ ۱۱ مئی درست نہیں۔ تاہم صابر کلوروی لائق مبارکباد ہیں کہ انہوں نے محققانہ دیانت داری کا ثبوت دیا۔ راقم الحروف کو اصل خط دستیاب ہو چکا ہے۔ اسے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس خط کی صحیح تاریخ ۱۱ مارچ ۱۹۳۴ء ہے اور یہ تاریخ خط کی پیشانی پر نہیں اس کے آخر میں درج ہے۔ اس خط کی صحیح تاریخ کا علم ہو جانے سے میرا دعویٰ سچا اور مضبوط ہو گیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لمعہ نے دو ماہ قبل نہیں بلکہ تقریباً دو ماہ قبل اقبال کو برقی علاج کے لئے بھوپال جانے کا مشورہ دیا تھا۔

بھوپال میں علامہ اقبال کا قیام 'ریاض منزل' میں تھا اور وہ سر راس مسعود کے مہمان تھے۔

[1] مکاتیب اقبال کے ماخذ۔ ایک تحقیقی جائزہ۔ اقبال ریویو۔ جولائی ۱۹۸۲ء (ص ۵۰)

انہوں نے علامہ کی مہمان نوازی اور ان کے آرام و آسائش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ بھوپال سے علامہ نے لمعہ حیدرآبادی کو بھی خط لکھا تھا جس کے بارے میں صہبا لکھنوی فرماتے ہیں:

" بھوپال سے تحریر کردہ یہ خط نہ صرف اقبال سے لمعہ کے قریبی روابط کی نشاندہی کرتا ہے بلکہ اس بات کا انکشاف بھی کہ اقبال لمعہ کو اپنے قیمتی مشوروں سے برابر نوازتے تھے اور ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کے دل سے معترف تھے۔ لکھتے ہیں:

" مخدومی۔ تسلیم

میں یہ خط آپ کو بھوپال سے لکھ رہا ہوں۔ اس سے قبل بھی آپ کو ایک خط لکھ چکا ہوں ملا ہوگا۔ آپ کی تازہ نظم میں پڑھ کر بہت خوش ہوا۔ اس میں اصلاح کی گنجائش نہیں ہے میں یہ سُن کر بہت خوش ہوا کہ آپ مثنوی مولانائے روم سے استفادہ حاصل کر رہے ہیں۔ دنیا کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ آپ کی عمر کے لحاظ سے بالکل درست ہے مگر آپ کو اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ دنیا ایک بہت اہم مقام ہے اور اس سے صحیح استفادہ حاصل کرنے کے لئے بھی انسان کامل بننے کی کوشش کرنی چاہئے۔ مولانا روم کو بغور پڑھئے اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھئے کہ جو کچھ آپ کا ضمیر اس خصوص میں آپ کو مشورہ دے اس سے انکار نہ ہو۔ میرے گلے کی حالت اب رو بصحت ہے۔ آپ کے گراں قدر مشوروں کا شکریہ۔

نگہدار آنچہ در آب و گل تست — سرود و سوز و مستی حاصل تست

تہی دیدم سبوے این و آن را — مے باقی بہ مینائے دل تست

آپ نے میرا حال دریافت فرمایا ہے۔ شکریہ۔

[1] علامہ اقبال کا استفادہ حاصل کرنا لکھنا تعجب خیز ہے۔ چند برس پہلے اس پر "ہماری زبان" دہلی میں کافی بحث رہی۔ (معارف)

زندہ ہوں، دل مضمحل، مسرت فنا، الحمدللہ۔ خیر صلاۃ۔ خدا حافظ۔

مخلص محمد اقبال لاہور

۲۰ فروری ۱۹۳۵ء

خط کے آخر میں "مخلص محمد اقبال لاہور" شاید اس لیے لکھا ہے کہ فروری کے آخر میں وہ بھوپال سے روانہ ہونے والے تھے۔ یہ خط ۲۰ فروری ۱۹۳۵ء کا تحریر کردہ ہے اور خط کے آغاز ہی میں انہوں نے لکھا ہے "میں یہ خط آپ کو بھوپال سے لکھ رہا ہوں" مقصد یہ تھا کہ لمعہ انہیں لاہور کے پتے پر جواب دیں۔ اگر بھوپال میں طویل قیام ممکن ہوتا تو سید نذیر نیازی کے خطوط کی طرح وہ "ریاض منزل" کا پتہ اس خط پر ضرور تحریر کرتے۔ لمعہ سے ان کی مستقل خط و کتابت تھی جیسا کہ اقبال نامہ (صفحات ۲۶۲ تا ۲۹۸) کے مطالعہ سے ظاہر ہے۔[1]

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قیام بھوپال کے دوران (۳۱ جنوری سے ۸ مارچ ۱۹۳۵ء) علامہ اپنی صحت کے بارے میں صرف دو دوستوں کو مطلع کرتے رہے۔ ایک سید نذیر نیازی اور دوسرے ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ۔ صہبا لکھنوی اور ڈاکٹر اخلاق اثر[2] نے اس مکتوب کو اپنی عالمانہ اور تحقیقی کتابوں میں جگہ دے کر محققانہ دیانت داری کا ثبوت دیا ہے۔ صہبا لکھنوی نے اس خط کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"۳۱ جنوری تا ۸ مارچ ۱۹۳۵ء کے پہلے قیام بھوپال کے دوران سید نذیر نیازی کے علاوہ اقبال کا ایک خط ہمیں اقبال نامہ میں ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ کے نام بھی ملتا ہے جو انہوں نے بھوپال ہی سے لکھا تھا۔ اس خط کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں کہ "ریاض منزل" کے پرسکون اور مسرت بخش ماحول میں وہ نہ صرف مطالعۂ فکر شعر اور اصلاح شعر میں مصروف رہتے تھے بلکہ اپنے عقیدت مندوں اور نیاز مندوں کو جو پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے خط و کتابت

[1] اقبال اور بھوپال۔ ص ۱۱۰-۱۱۱ [2] اقبال نامے۔ ص ۳۹-۴۰۔

میں بھی یاد رکھتے تھے اور اپنے قیمتی مشوروں سے انہیں نوازتے تھے۔ گویا شاعر مشرق کی فکر کا مرکز بھوپال تھا جس سے پورا ہندوستان فیضیاب ہو رہا تھا۔ ان کی صحت و عافیت، ان کی آفاقی گیر فکر، ان کی شاعرانہ بصیرت کا ایک محور بھوپال بھی بن گیا تھا۔"[1]

مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ ممتاز اقبال شناس اور محقق عبدالقوی دسنوی نے "اقبال اور دارالاقبال بھوپال" میں 'ریاض منزل بھوپال' سے لکھے گئے خطوط کی جو فہرست دی ہے اس میں لمعہ کے نام مذکورہ مکتوب اقبال کو شامل نہیں کیا اور نہ عدم شمولیت کی کوئی وجہ بتائی۔ کیا یہ بات ادبی تحقیق کے اصول کے منافی نہیں؟ اپنے ایک مضمون نما خط میں عبدالقوی دسنوی نے مکتوب اقبال بنام لمعہ پر ایک اعتراض یہ کیا تھا کہ "اور علامہ کا مشورہ کے لئے شکریہ کیسا؟ کیا اقبال یہ نہیں لکھ سکتے تھے کہ وہ اپنا علاج بھوپال ہی میں کرا رہے ہیں۔"[2] اگر عبدالقوی دسنوی مکتوب اقبال بنام لمعہ محررہ ۲۰ فروری ۱۹۳۵ء کو بغور پڑھتے تو وہ یہ اعتراض نہ کرتے۔

علامہ اقبال نے خط کی ابتدا میں تحریر کیا تھا "میں یہ خط آپ کو بھوپال سے لکھ رہا ہوں۔ اس سے قبل بھی آپ کو ایک خط لکھ چکا ہوں۔ ملا ہوگا۔" پچھلے کئی سالوں سے میں لمعہ کے نام مکاتیب اقبال تلاش کر رہا ہوں۔ جو چند خطوط دستیاب ہوئے ہیں ان میں بھوپال سے لکھا گیا ایک مختصر خط بھی ہے اور یقیناً یہ وہی خط ہے جس کا ذکر علامہ اقبال ۲۰ فروری ۱۹۳۵ء کے خط میں کر چکے ہیں۔ یہ غیر مطبوعہ خط ہے اور کہیں نہیں شایع ہوا ہے۔ اس خط کے دریافت ہونے سے لمعہ کی اس بات کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ علامہ اقبال نے انہیں تقریباً پچاس ساٹھ خطوط لکھے تھے۔[3] یہ غیر مطبوعہ خط بھوپال سے لکھا گیا ہے جس پر ۱۲ فروری ۱۹۳۵ء کی تاریخ درج ہے۔ یہ دو سطری خط ہے۔ دراصل علامہ اقبال نے لمعہ کے بھیجے ہوئے خط پر مختصر جواب لکھ کر اسے لمعہ کو دوبارہ بھیج دیا ہے۔

[1] اقبال اور بھوپال۔ ص ۱۰۹۔ [2] ہماری زبان دہلی ۸ اپریل ۱۹۸۹ء ص ۲۔ [3] تحقیقات وتاثرات۔ ص ۴۹۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ لمعہ نے علامہ اقبال کو برقی علاج کے لئے بھوپال جانے کا مشورہ دیا تھا اقبال نے اس مشورے کے لئے لمعہ کا شکریہ ادا کیا تھا اور بجلی کے ذریعے علاج کرانے پر آمادگی کا اظہار بھی کیا تھا لیکن اس وقت وہ ڈاکٹر مختار انصاری کے بڑے بھائی حکیم نابینا صاحب دہلی والے کے زیر علاج تھے اور اس سے کچھ فرق محسوس ہو رہا تھا۔ چنانچہ اقبال لمعہ کو لکھتے ہیں:

" حکیم نابینا صاحب دہلی والے علاج کر رہے ہیں۔ فرق ضرور ہے مگر عام طور پر گفتگو کرنے میں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ انشاء اللہ ضرور بھوپال جاؤں گا اور بجلی کے علاج سے استفادہ حاصل کروں گا۔" (خط محررہ یکم دسمبر ۱۹۳۴ء)

اس کے دس روز بعد پھر ایک اور خط علامہ نے لمعہ کو لکھا اور بتایا کہ:

" الحمد للہ میری صحت عامہ ٹھیک ہے۔ مگر گلے کی شکایت ابھی رفع نہیں ہوئی گو کسی قدر بہ نسبت سابقہ فرق ضرور ہے۔ حکیم نابینا صاحب دہلی والے علاج کر رہے ہیں اور صحت کا یقین دلاتے ہیں۔" (خط محررہ ۱۱ دسمبر ۳۴ء)

لمعہ جو علامہ کی صحت کے بارے میں فکر مند رہتے تھے انہوں نے پھر ۸ فروری ۱۹۳۵ء کو ایک خط لکھ کر علامہ کی صحت کا حال دریافت کیا۔

دریافت شدہ اصل خط کا متن

تونڈا پور

قبلہ من

دام ظلکم

حدادب، مزاج عالی، میں بے حد شکر گزار ہوں گا اگر آپ بہ کمال عنایت اپنی صحت سے مطلع فرمائیں گے۔ غالباً حکیم نابینا صاحب ہی معالجہ کر رہے ہوں گے۔ خدا کرے آپ مع الخیر ہوں[1] والسلام خاکسار

(حاشیہ ص ۵۷ پر)

جاوید میاں کو دعائیں۔

محمد عباس علی خاں

۸ فروری ۳۵ء

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے بھوپال جانے کے پروگرام سے اقبال نے لمعہ کو مطلع نہیں کیا تھا لمعہ یہی سمجھتے رہے کہ حکیم نابینا صاحب اقبال کا علاج کر رہے ہیں۔ دستیاب مکاتیب اقبال کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ نے برقی علاج کے لئے بھوپال جانے کے پروگرام سے صرف سید نذیر نیازی کو مطلع کیا تھا[2]۔ ظاہر ہے انہوں نے سر راس مسعود سے بھی خط و کتابت کی ہوگی۔ لمعہ کے دئے گئے مشورے کے بارے میں حمیدیہ اسپتال کے ڈاکٹروں سے مشورہ کرنے کے متعلق بھی سر راس مسعود کو خطوط لکھے ہوں گے۔ لیکن اب تک اس مضمون کا کوئی خط منظر عام پر نہیں آیا ہے۔ حمیدیہ اسپتال کے ماہر ڈاکٹروں سے مشورے کے بعد سر راس مسعود نے اقبال کو بھوپال آکر علاج کرانے کی دعوت دی اس کا مطلب یہ نہیں کہ سر راس مسعود نے ہی علامہ کو برقی علاج کے لئے بھوپال آنے کا مشورہ دیا تھا۔

علامہ ماہ جنوری ۱۹۳۵ء میں اپنی بیماری کے ساتھ والدۂ جاوید کی بیماری سے بھی پریشان رہے حکیم نابینا صاحب کا علاج جاری تھا لیکن آواز میں کوئی فرق محسوس ہو رہا تھا۔ بالآخر انہوں نے برقی علاج کے لئے بھوپال جانے کا قصد کیا۔ وہ پریشانیوں کے باعث اپنے اس ارادے سے لمعہ کو مطلع کرنا بھول گئے۔ اتنا ہی نہیں بھوپال پہنچنے پر بھی انہیں خیال نہ آیا۔ فروری کا پہلا ہفتہ طبی معائنہ اور

(حاشیہ ص ۵۶) [1] لمعہ حیدرآبادی اکثر نون غنہ اعلان نون کے ساتھ لکھنے کے عادی تھے۔ علامہ اقبال کے بھتیجے اعجاز احمد نے بھی اس کی نشاندہی کی ہے انہوں نے ایک شعر میں لفظ 'افسوں' کو 'افسون' لکھا ہے (دیکھئے مظلوم اقبال ص ۱۸۱ اقبال اور بھوپال ص ۲۸، حاشیہ ص ہذا [2] مکتوبات اقبال، سید نذیر نیازی۔ ص ۲۰۴، ۲۴۱، ۲۴۳، ۲۵۳۔

ULTRA VIOLETRAYS سے غسل لینے میں گزرا۔ جب لمعہ حیدرآبادی کا مذکورہ بالا خط (محررہ ۸ر فروری ۱۹۳۵ء) لاہور سے ہوتا ہوا بھوپال پہنچا تو علامہ کو احساس ہوا کہ جس شخص نے برقی علاج کے لئے بھوپال جانے کا مشورہ دیا تھا اسی کو وہ بھوپال جانے کے پروگرام سے مطلع نہ کر سکے چنانچہ اسی احساس نے انہیں فوری جواب دینے پر مجبور کیا اور علامہ نے ایک علاحدہ کاغذ پر جواب دینے کی بجائے لمعہ کے بھیجے ہوئے خط پر جواب دیا اور اس کے لئے معذرت بھی طلب کرلی۔

جناب من

میں بھوپال میں ہوں۔ یہاں بجلی اور ULTRA VIOLET RAYS سے علاج ہو رہا ہے۔

اسی کاغذ پر جواب معاف فرمائے

محمد اقبال

۱۲ر فروری ۳۵ء

جناب عبدالقوی دسنوی نے اپنے مضمون میں یہ اعتراض کیا تھا کہ "کیا اقبال (لمعہ کو) یہ نہیں لکھ سکتے تھے کہ وہ اپنا علاج بھوپال میں کرا رہے ہیں"۔ مذکورہ بالا خط سے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے۔

غرض کہ ان تمام شواہد سے اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ علامہ اقبال کو برقی علاج کے لئے بھوپال جانے کا مشورہ ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ ہی نے دیا تھا۔

فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس

از: جناب علیم صبا نویدی

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا اثر و رسوخ بڑھ جانے کے بعد رفتہ رفتہ جب برطانوی اقتدار قائم ہوا تو سب سے پہلے اس نے ایک ایسا تعلیمی نظام قائم کیا جس کے ذریعہ ہندوستانی زبان و تہذیب کے ساتھ انگریزی تہذیب و تمدن کو بھی ہندوستان میں رائج کر دیا جائے، اس سلسلہ میں جو ٹھوس اقدامات ہوئے اس کے متعلق ہندوستان کا چاہے جو کچھ بھی رویہ رہا ہو انگریزوں کا رویہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ تین اہم ترین ہندوستانی شہروں کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں اس کی جڑیں مضبوط کر دی جائیں، اسی غرض سے کلکتہ سینٹ ولیم کالج، بمبئی کالج اور مدراس میں فورٹ سینٹ جارج کالج قائم ہوا۔ چونکہ دہلی صدیوں تک ہندوستان کے مختلف حکمرانوں کا مرکز رہا ہے۔ اس لئے برطانوی حکمرانوں نے دہلی میں بھی مدرسۂ غازی الدین خان کو قدیم دہلی کالج کے نام سے (۱۸۲۵ء میں) موسوم کر دیا، جس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔ پہلے فورٹ سینٹ جارج کالج سے متعلق معلومات پیش کئے جاتے ہیں۔

آج جس کالج کو پریسیڈنسی کالج کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس کا آغاز ۱۸۱۲ء میں فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس کے طور پر ہوا تھا۔ اس کالج کے قیام کا مقصد ہی یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین اور فوجی ملازمین کو اور ان کی اولاد کو دیسی زبانوں کی تعلیم دی جائے۔

ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال کے مطابق مدراس کے گورنر مسٹر جوزف کلیکٹ (Joseph Collect) نے ۱۷۱۷ء میں "فورٹ سینٹ جارج اسکول کی بنیاد رکھی (۱) جو بعد میں "رائٹرس کالج" کے نام سے مشہور ہوا، ایسٹ انڈیا کمپنی کا یہ پہلا ادارہ تھا جس میں مدراس پریسیڈنسی کے کلکتہ، بمبئی، مدراس کے سول ملازمین دیسی زبانوں کی تعلیم حاصل

---

(۱) مدراس میں اردو زبان کی نشو و نما۔

۲۶۔ امیر النساء بیگم اسٹریٹ، ماؤنٹ روڈ، مدراس

کرتے تھے یہ کالج قلعہ سینٹ جارج میں برسوں قائم رہا۔

محققین نے فورٹ سینٹ جارج کالج کا قیام ۱۸۰۰ء بتایا ہے، مگر ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ اور ڈاکٹر بی۔ بی شمرانے اس کے قیام کی تاریخ ۱۸۰۸ء بتائی ہے۔ پروفیسر سری نواس آچاری نے اپنی تاریخ میں فورٹ سینٹ جارج کالج کے قیام کا سنہ ۱۸۱۲ء بتایا ہے (۱) ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال نے بھی اس کی تاریخ قیام ۱۸۱۲ء ہی بتائی ہے جو صحیح القیاس معلوم ہوتی ہے۔ جب ۱۸۰۰ء میں اس کا قیام عمل میں آیا تھا تو کمپنی نے فیصلہ کیا تھا کہ اس کو بند کر دیا جائے، یہ حکم نامہ گورنمنٹ سکریٹری ٹامس براؤن کی ایما پر صادر ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے حکم نامہ مورخہ ۱۶ رمئی ۱۸۰۵ء میں کالج کونسل کو ہدایت کی تھی کہ مدراس اور بمبئی کے طلبہ کو بمبئی بھیج دیا جائے لیکن بمبئی کے کالج سے متعلق معلومات مفقود ہیں۔ اس طرح ۱۸۱۲ء میں مدراس ہی میں دوبارہ اس کے قیام کا فیصلہ ہوا۔ فورٹ سینٹ جارج اسکول، فورٹ سینٹ جارج کالج میں تبدیل ہونے سے پہلے بھی ہندوستانی زبان و ادب کی خدمت میں مصروف تھا۔ ہندوستانی ادبیات کے ماہر انگریزوں نے جیسے کپتان ہنری ہیرس اور جوزف اسمتھ نے ہندوستانی زبان و ادب سے خاص دلچسپی لی تھی (۲) فورٹ سینٹ جارج کالج کے مقاصد وہی تھے جو کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کے تھے۔ اس کے طلبہ کی تعداد میں جب بہت اضافہ ہوگیا تو کالج قلعہ کے احاطہ سے نکل کر ۱۸۱۶ء میں اس کو مسٹر گارو (Garrow) کے مکان میں جو دس سال کے معاہدے پر لیا گیا تھا اور اس سے منسلک ایک تاجر مسٹر مواریٹ (Mooriod) کے مکان میں جو نو ہزار روپے میں خریدا گیا تھا منتقل کر دیا گیا (۳)

کپتان ہنری ہیرس (Capt. Henry Haris) نے ۱۷۹۱ء میں ہندوستانی لغت شائع کی تھی اور جنرل جوزف اسمتھ کی ایما پر میر عطا حسین خان تحسین نے فارسی کے مشہور قصہ چہار درویش کا اردو ترجمہ ۱۷۷۵ء سے قبل ''نوطرز مرصع'' کے نام سے کیا، منشی شمس الدین احمد کی حکایات الجلیلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فورٹ سینٹ جارج کالج میں ۱۸۰۶ء/ ۱۲۲۱ھ سے ''سروران رفیع الشان'' کی تعلیم و تدریس میں مصروف تھے۔ اس طرح فورٹ سینٹ جارج کالج کا قیام ۱۸۱۲ء سے پہلے قرار دیا جاتا ہے۔ مگر یہ درست نہیں معلوم ہوتا، غالباً یہ کالج کے

(۱) ڈسکرپٹیو لسٹ آف پکچرس ان گورنمنٹ ہاؤس ص ۱۳۔ (۲) مدراس میں اردو ادب کی نشو و نما ص ۲۰۹، ۲۱۰ (۳) ڈاکٹر افضل الدین اقبال مدراس میں اردو زبان و ادب کی نشو و نما۔

بجائے جارج اسکول ہوگا۔

مورخ ایچ ڈی ایف نے اپنی تصنیف میں فورٹ سینٹ جارج اسکول (رائٹرس کالج) کے قیام کا سنہ ۱۷۱۵ء بتایا ہے جس کا ذکر کسی اور نے نہیں کیا ہے۔

وثوق اور قطعیت سے اس کالج کے قیام کی تاریخ متعین نہیں کی جاسکتی مگر اتنا ضرور ہے کہ ۱۸۰۸ء تا ۱۸۱۲ء ہی کے درمیان کا کوئی سنہ ہوگا۔

فورٹ سینٹ جارج کالج میں مقامی زبانوں کے علاوہ عربی، فارسی کی بھی تعلیم کا انتظام تھا۔ یہاں دیگر علوم و فنون مثلاً قانون، ریاضی کے شعبے بھی قائم تھے۔ اس زمانے میں مدرسوں اور کالجوں میں درس و تدریس کے فرائض سرانجام دینے والوں کو منشی کہا جاتا تھا، جو مشرقی علوم و السنہ کی کما حقہ تعلیم دیتے تھے۔ اس کالج کے شعبہ عربی و فارسی میں تدریس کے فرائض انجام دینے والوں میں مولوی تراب علی نامی، مولوی حسن علی ماہلی (جو عربی و فارسی کے علاوہ ریاضی کا بھی درس دیتے تھے) مولوی شمس الدین احمد اور سید مہدی واصف تھے۔ ان کے علاوہ اس کالج کے شعبہ عربی و فارسی و اردو میں ابراہیم بیجاپوری، منشی مظہر، قاضی ارتضی علی خان، سید شاہ حسین حقیقت، سید عبدالودود عاشق، غلام حسین معاون، مرزا عبداللہ باقی وفا، عبدالقادر ہمراز، سید تاج الدین، غلام دستگیر، محمد خان، میر حیدر بلگرامی وغیرہ کے نام بھی لئے جاتے ہیں۔

تراب علی نامی، حسن علی ماہلی، سید حسین شاہ حقیقت، قاضی ارتضی علی خان، محمد ابراہیم بیجاپوری اور مرزا عبدالباقی وفا وغیرہ کو شمالی ہند سے یہاں بلایا گیا تھا تا کہ اس کا ادارہ تعلیم منظم اور باضابطہ ہو۔

کالج کے کتب خانہ میں دیگر زبانوں کی کتب کے علاوہ بڑی تعداد میں عربی، فارسی اور اردو کتابوں کا ذخیرہ بھی تھا (۱) یہ کتابیں مطبوعہ بھی تھیں اور مخطوطات کی شکل میں تھیں مثلاً اس میں شیخ عین الدین کے مذہبی رسالے ''احکام و مسائل'' کا پتہ چلتا ہے جو مخطوطہ کی شکل میں وہاں موجود تھا۔ شمس العشاق اور شاہ میراں جی کی دکنی تصنیفات ''گل باس'' اور ''جل ترنگ'' کے قلمی مخطوطے بھی تھے۔ ولیم ٹیلر نے یہاں پائے جانے والے مخطوطات کی فہرست دو جلدوں میں مرتب کر کے فورٹ سینٹ جارج کالج گزٹ پریس سے شائع کی تھی۔ ٹیلر کا بیان ہے کہ یہاں موجود مخطوطات کی تعداد تین ہزار تھی (۲)

(۱) سید شمس اللہ قادری۔ اردوئے قدیم ص ۱۱۵۔ (۲) بحوالہ ''مدراس میں اردو ادب کی نشو و نما''۔

کالج کے نصاب کو مدنظر رکھ کر تصنیف و تالیف کا کام بھی شروع کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر رفیعہ رقمطراز ہیں۔

''ایسٹ انڈیا کمپنی نے جنوبی ہند کی زبانوں میں اردو کی اس قدیم شکل کو ''دکنی'' نام دے کر اس کی توسیع واشاعت میں خاطر خواہ حصہ لیا۔ جہاں کلکتہ میں ہندوستانی کتابیں تیار کی جارہی تھیں، وہیں مدراس میں اردو کی قدیم شکل دکنی کا پرچار ہورہا تھا''(۱)

کالج نے اپنا ایک نجی پریس قائم کیا تھا جس میں کالج کی کتابیں طبع ہوتی تھیں۔ اس سلسلے کی بعض تفصیلات ملاحظہ ہوں:

ہندوستان میں طباعت کا آغاز ساحلی علاقوں میں ہوا مثلاً مغربی ساحل پر گوا، کوئلون، کوچین، ٹرانکور، بمبئی اور پونا میں اور مشرقی ساحل پر فورٹ سینٹ جارج مدراس، فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور سری رام پور کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ یہاں محض عیسائیت کی ترویج کے لئے مطابع قائم ہوئے تھے کیتھولک مبلغوں نے ان پر بے شمار سرمایہ صرف کیا تھا اور مذہبی لٹریچر کو مقامی زبانوں میں شائع کرنے کا کام بڑے زور پر تھا (پرولکر اور بمل کماردت کی اطلاعات کے مطابق بحوالہ دی پرنٹنگ پریس اور انڈیا (پرولکر) ہندوستان کے زمانہ قدیم ووسطی کے کتب خانے (بمل کماردت)۔

ڈاکٹر بمل کماردت کی اطلاع کے مطابق مدراس میں پہلا چھاپہ خانہ ویپری (Vepery) میں قائم ہوا بعد میں یہ ڈایوسن پریس (Diosen Press) کے نام سے مشہور ہوا، اس پریس سے فورٹ سینٹ جارج کالج نے تلگو، ٹمل، کنڑی، اردو، عربی، فارسی وغیرہ زبانوں کی متعدد کتابیں طبع کرائیں۔ مثلاً ''وسیط النحو'' (تراب علی نامی ۱۸۲۰ء) ''دکنی انوار سہیلی'' (منشی ابراہیم بیجاپوری ۱۸۲۶ء) ''منتخب العرف'' (سید امیر حیدر بلگرامی ۱۸۲۷) ''حکایت الجلیلہ'' جلد اول (منشی شمس الدین احمد ۱۸۳۶ء) ''حکایت الجلیلہ'' جلد دوم (۱۸۳۷ء) میں شائع ہوئیں۔ یہاں یہ بات کہہ دینی ضروری ہے کہ گریرسن (Grierson)

(۱) ہماری زبان علی گڑھ ۸ ستمبر ۱۹۷۰ء۔

کے بیان کے مطابق اس مطبع میں ایک کتاب جینٹو زبان کی قواعد ۱۸۰۷ء میں مدراس میں چھپی تھی۔ اس اعتبار سے یہ مطبع ہندوستان بھر میں سب سے پہلے قائم ہوا تھا۔ جنوبی ہند کے جس چھاپے خانے کا پتہ چلتا ہے وہ مدراس ہی میں قائم ہوا تھا۔

جناب عتیق صدیقی ''ہندوستانی اخبار نویس'' میں رقمطراز ہیں کہ مدراس میں پہلا چھاپہ خانہ انیسویں صدی کے تیسری یا چوتھی دہائی میں قائم ہوا، یہی وہ زمانہ تھا جب شمالی ہند میں بھی اردو کے چھاپے خانے کھولے جارہے تھے اور اردو کے اخباروں کے اجراء کا دور شروع ہورہا تھا۔ جناب عتیق صدیقی نے مدراس کی پہلی اردو مطبوعہ کتاب حکایات الجلیلہ (مطبوعہ ۱۸۳۶ء) کو قرار دیا ہے، جو صحیح نہیں ہے اس سے پیشتر فورٹ سینٹ کالج پریس سے ''دکنی انوار سہیلی'' شائع ہوچکی تھی اور پینتالیس سال پیشتر ۱۷۹۱ء میں کپتان ہنری ہیرس (Capt. Henry Harris) نے مدراس ہی سے ہندوستانی زبان کی ایک جامع لغت Analysis Grammer and Dictionary of the Hindustani Languages. کے نام سے شائع کی تھی۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ مدراس اردو طباعت کے معاملے میں ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے بہت آگے تھا۔ فورٹ سینٹ جارج کالج پریس سے متعدد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ علامہ عبداللہ یوسف علی کا بیان ہے کہ فارسی اور اردو ٹائپ ہندوستان میں اٹھارہویں صدی کے اختتام اور انیسویں صدی کے آغاز کے دور اول میں استعمال کیا گیا تھا۔ ٹائپ کی چھپائی کا سلسلہ لیتھو کی چھپائی سے پہلے شروع ہوگیا تھا (۱)۔ اردو ٹائپ عرصہ تک مدراس میں مستعمل رہا۔ سرکاری قوانین وضوابط ٹائپ میں چھاپے جاتے تھے۔ فورٹ سینٹ کالج مدراس کی متعدد کتابیں ٹائپ میں شائع ہوئی تھیں۔ لیکن اردو داں طبقے میں اس زمانے میں ٹائپ مقبول نہیں ہوسکا تھا۔ اردو ٹائپ کی رفتار سست رہی۔ ۱۸۳۶ء میں لیتھوگرافی کا استعمال شروع ہوا۔ لیتھوگرافی کے مقابلے میں بھی مدراس ہندوستان کے دوسرے مقامات سے بہت آگے تھا ۱۸۵۷ء سے پیشتر ہی مدراس میں لیتھوگرافی کے مطابع قائم ہوچکے تھے۔

(۱) انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ص ۷۵

مطبع کشن راج سرکاری مطبع کی حیثیت سے قائم ہوا تھا۔ ''دیوان تاباں'' ۱۸۳۴ء/
۱۲۴۹ھ میں چھپا تھا۔ (اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۸۳۴ء سے پہلے قائم ہو چکا تھا۔ اسی مطبع سے
۱۸۴۴ء میں شیریں سخن خان راقم کی ''میزان الاشعار'' اور ۱۸۴۵ء میں ''رسالہ اعظم الصناعہ''
شائع ہوئے۔ قاضی بدرالدولہ محمد صبغۃ اللہ قاضی القضاۃ محکمۂ عالیہ سرکار نواب کرناٹک کی بہت
سی کتابیں بھی مطبع کشن راج میں طبع ہوئیں جن میں فوائد بدریہ (قدیم دکنی زبان) ۱۸۴۵ء میں
(جس کا اردو ترجمہ، محمد عتیق نے چار جلدوں میں کیا ہے ''سیرۃ النبی ﷺ'' دو جلد میں تمل ناڈو
اردو پبلی کیشنز کے زیر اہتمام ۱۹۹۹ء۔ ۱۹۹۸ء میں چھپ چکی ہیں اور ''گلزار ہدایت''
(۱۸۴۷ء) میں قابل ذکر ہیں۔ مطبع کشن راج کو ''مطبع سرکاری'' کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا
تھا۔ آرکاٹ کے آخری رئیس نواب محمد غوث خان بہادر اعظم کا مشہور تذکرہ شعراء ''گلزار اعظم''
۱۸۵۵ء میں یہیں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد مطبع جامع الاخبار کا نام آتا ہے۔ اس کے مالک
رحمت اللہ تھے۔ ۱۲۵۷ھ مطابق ۱۸۴۱ء میں مدراس اور جنوبی ہند کا پہلا اخبار ''جامع الاخبار''
یہیں سے شائع ہوا تھا۔ اس مطبع نے بھی اردو کی بڑی خدمت کی تھی۔

فورٹ سینٹ جارج کالج میں تصنیف و تالیف کا ایک علیحدہ شعبہ تھا، جہاں سے
ہندوستانی، دکنی، عربی، فارسی، سنسکرت اور تامل وغیرہ کے علاوہ قانون اور ریاضی کی متعدد
کتابیں شائع ہوئیں (۱)

کالج کی اردو تالیفات میں ادبی تالیفات کے علاوہ مختلف مفید اور دلچسپ موضوعات
پر کتابیں پائی جاتی تھیں۔ صرف و نحو، لغت و قواعد، افسانہ تاریخ و سوانح اور اخلاقیات جیسے موضوعات
پر دکھنی زبان میں متعدد کتابیں لکھائی گئیں۔

یہ کالج قطب شاہی، عادل شاہی اور نظام سلطنتوں کے زوال کے بعد دکھنی زبان و ادب کا
ایک مرکز بن گیا۔ اس کالج کی جتنی اردو مطبوعات و مخطوطات دستیاب ہیں انہیں دکھنی زبان سے
موسوم کیا جاتا ہے۔ مثلاً ''حکایات الجلیلہ'' (داستان الف لیلۃ)، انوار سہیلی، سنگھاسن بتیسی، گلستان
اور بعض دیگر کتابوں کی زبان کو ان کے مترجمین نے دکھنی قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان
صاحب نے منشی محمد ابراہیم بیجاپوری کی ''دکنی انوار سہیلی'' کو قدیم اردو کا آخری بڑا نثری کارنامہ قرار دیا

(۱) مدراس میں اردو ادب کی نشو ونما۔

ہے۔ اسی کالج کے بعض اہل قلم جیسے سید تاج الدین نے ''گل دستۂ ہند'' میں منشی مظفر نے
''حیدر نامہ'' میں اور ''ملکہ زماں و کام کندلہ'' کے مترجم نے اپنی زبان کو ''دکھنی'' کے بجائے کرناٹکی
محاورہ سے موسوم کیا ہے۔

فورٹ سینٹ جارج کالج کے بعض مولفین گمنام ہیں جن کی غیر مطبوعہ تالیفات کی طرف
ڈاکٹر افضل الدین اقبال نے اشارہ کیا ہے:

(۱) ملکہ زماں و کام کندلہ (۲) سنگھاسن بتیسی (۳) ترجمۂ گلستان (۴) آئین و
قوانین افواج کمپنی علاقہ مدراس (۵) فوجی قوانین (۶) قواعد تعلیم فوج۔

اور مطبوعہ تالیفات کے ان ناموں کی طرف اشارہ کیا۔

(۱) رسالہ حروف تہجی (۲) تعلیم نامہ (۳) صنعت الحریر (۴) میزان الحساب
(۵) قانون فرد کورٹ (۶) گلستان سرباب (۷) قواعد لشکری (۸) عربی حکایت لطیفہ (۹)
سرکولر آرڈرس (۱۰) بکاؤلی (۱۱) چہار درویش (۱۲) گلستان ہندی۔

فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس مصنفین عربی، فارسی اور اردو کی بڑی ہمت افزائی کرتا تھا
تاکہ مفید اور وقیع کتابیں تیار ہو سکیں، اس ضمن میں اس نے اساتذہ و طلباء کو انعامات بھی مقرر
کر رکھے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی گراں بہا کتابیں شائع ہوئیں۔

قاضی ارتضی علی خان خوشنود کی تصنیف ''نقود الحساب'' پر ایک ہزار ہون انعام دیا
گیا۔ تراب علی نامی کی تصنیف ''وسیط النحو'' پر سات ہزار ہون دیئے گئے۔ مہدی واصف کو
تصنیف ''حدیقۃ المرام'' (فی تذکرۃ العلماء الاعلام) پر بھی سات ہزار ہون انعام میں دیئے
گئے۔ کالج ہی کے خرچ سے ان کی طباعت کا بھی انتظام ہوا۔ (۱)

افسوس کہ امتداد زمانہ سے اس کالج کی توجہ اردو عربی اور فارسی کی طرف سے کم ہوتی گئی
اور رفتہ رفتہ اس سے وابستہ لوگ بکھرنے لگے اور تمل ناڈو کے دیگر مقامات میں نجی اردو عربی و فارسی
ادارے قائم ہونا شروع ہوگئے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے تمل ناڈو میں چھوٹے بڑے ہر قسم کے
ادارے قائم ہوگئے اور لوگ حسب الوسع اپنے بچوں کی عربی، فارسی اور اردو تعلیم میں منہمک ہوگئے۔
آگے چل کر ان میں سے بہت سے ادارے جامعہ کی شکل بھی اختیار کرگئے، اس طرح کے بہت سے
بڑے بڑے عربی کالج آج بھی تمل ناڈو میں اپنے طور پر خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔

فورٹ سینٹ جارج کالج تقریباً ۱۸۵۴ء تک کام کرتا رہا۔ اس کے بعد کالج کی حیثیت کم

(۱) انڈین ہسٹاریکل ریکارڈ جلد ہشتم ص ۱۵۱۔

ہوگئی اور اس کا انضمام مدراس لٹریری سوسائٹی کے ساتھ ہوگیا۔(۱)

دہلی کالج کے قیام سے متعلق مضمون کے ابتداء ہی میں بتایا جاچکا ہے کہ ایک مدرسہ کا آغاز مدرسۂ غازی الدین خان کے نام سے ۱۷۹۲ء میں ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۸۲۴ء میں یہ مدرسہ اخراجات کی کمی کی بنا پر بند ہوگیا تھا۔۔ یہ تحقیق بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تھی مگر نسیم اختر بنارسی نے اپنے ایک مضمون ''دہلی کالج کی تاریخ اور اس کی علمی و ادبی خدمات۔ایک مختصر سا جائزہ'' (شائع شدہ ماہ نامہ سہیل گیا'' شمارہ ۵ جلد ۵۷ ص ۷۰ ، ۱۵) میں اس کی تردید کی ہے اور بیان کیا ہے کہ انیسویں صدی میں دہلی کالج کا قیام باقاعدہ ۱۸۲۵ء میں عمل میں آگیا تھا، لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں یہی وہ پہلا ادارہ تھا جہاں اردو زبان کے ذریعے سائنس، ریاضی، انگریزی ادبیات، اخلاقیات، تاریخ و جغرافیہ، قانون، طب، زراعت اور نیچرل فلاسفی وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ کالج کا امتیازی وصف اور قابل ذکر عمل یہ بھی تھا کہ یہاں عربی، فارسی اور اردو کے پہلو بہ پہلو ہندی اور سنسکرت کی تدریس کا بھی مکمل انتظام تھا''۔

فاضل مضمون نگار نے فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج کے موازنہ میں لکھا ہے کہ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوچکا تھا لیکن اس کالج کی خدمات فارسی، قدیم داستانیں اور قصے اردو زبان میں منتقل کرنے اور ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت کے لئے آنے والے نو وارد انگریزوں کو اردو سکھانے تک محدود تھیں۔ اس لئے یہ کالج صرف زبان دانی کالج ہوکر رہ گیا اور یہ صرف انگریزوں کے لئے تھا نہ کہ ہندوستانیوں کے لئے مگر دہلی کالج اردو زبان اور اردو داں حلقے کو یورپی علوم وفنون اور انگریزی ادبیات و فلسفے سے روشناس کرنے اور ہندوستانی عوام کے لئے قائم ہوا تھا۔

پھر لکھتے ہیں کہ دونوں کالجوں کے اغراض و مقاصد میں بنیادی فرق ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے ادبی کارنامے کا دائرہ نو آموز انگریزوں کو سادہ عام بول چال کی زبان سکھانے تک محدود تھا، مگر دہلی کالج کے اردو، عربی اور فارسی میں ادبی کارنامے گرانقدر، متنوع اور رنگارنگ موضوعات پر مشتمل ہیں۔

ڈاکٹر سمیع اللہ کا بیان ہے کہ انیسویں صدی میں سب سے پہلے مغربی علوم وفنون کے ورثہ کو جذب کرنے کا باقاعدہ عمل دہلی کالج نے شروع کیا تھا، جسے ہم اس روایت کا نقطۂ آغاز کہہ سکتے ہیں (۲)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موصوف کو فورٹ سینٹ جارج کالج مدراس کے ادبی و علمی کارناموں سے پوری طرح واقفیت نہیں ہے۔

---

(۱) ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ بحوالہ فورٹ سینٹ کالج ص ۹۔ (۲) انیسویں صدی میں اردو تصنیفی ادارے ص ۳۲۸۔

تلخیص و تبصرہ

لائبیریا

از: کلیم صفات اصلاحی

لائبیریا مغربی افریقہ کے ساحل کا ایک ملک ہے۔ ۱۸۴۶ء میں اس نے خود مختاری حاصل کی۔ خود مختاری حاصل کرنے والے افریقی ممالک میں یہ سب سے قدیم ملک ہے۔ یہ مدتوں مغربی استعمار کی سازشوں کا شکار رہا۔ یہاں کے دار الحکومت شہر مونروفیا (۱) کی تاسیس کی ابتداء ۱۸۲۱ء میں ساحل پر ہوئی تھی۔

لائبیریا کے شمال میں غینیا (Guenea) جنوب میں بحر اٹلانٹک، مشرق اور شمال مشرق میں ساحل العاج (Ivory Coast) مغرب میں سیر الیون (Surraleone) ہے۔ اس کا کل رقبہ ۹۷۷۵۴ مربع کیلومیٹر ہے (۲)۔ دار السلطنت Monrovia ساحل پر واقع ہے۔ اسی وجہ سے اس کا شمار وہاں کی اہم بندرگاہوں میں ہوتا ہے۔ اس کے اہم شہروں میں جرنفیل

---

(۱) اس کا انگریزی نام (Monrovia) عربی ناموں کو انگریزی قالب "World Reference Atlas" کی مدد سے دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ڈارلنگ کنڈرس لمیٹڈ لندن سے شائع ہوئی ہے اس میں دنیا کے آباد علاقوں کے جغرافیائی، اقتصادی، سیاسی اور تہذیبی و علمی حالات نہایت جانفشانی اور محنت سے قلمبند کئے گئے ہیں۔ بعض ممالک کے وزرائے اعظم اور مشہور لوگوں کی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ علمی حلقے میں اس کی بڑی پذیرائی ہورہی ہے۔ جس کا اندازہ اس کے متعدد ایڈیشنوں سے ہوتا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۹۴ء میں، دوسرا ۱۹۹۵ء، تیسرا ۱۹۹۶ء اور چوتھا ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا۔ تاہم اسلامی ملکوں اور غیر اسلامی ممالک میں مسلم نمائندگی کے صحیح حالات سے چشم پوشی نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ مترجم۔

(۲) ورلڈ ریفرنس اٹلس نے اس کا کل رقبہ ۹۴۳۲۰ اسکوائر فٹ یعنی ۱۸۹ ۷ ۱۳ اسکوائر میل لکھا ہے۔ ص ۳۳۶

(Greenville)، وبل، جبارنجا (Juarzon) وغیرہ ہیں۔ لائبیریا کی زمین ہموار میدانوں پر مشتمل ہے، جس کی چوڑائی کہیں بیس اور کہیں ۸۰ رکیلومیٹر ہے۔ اس سے لگا ہوا مفترس کا علاقہ ہے، جو ٹیلوں اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے درمیان ہے۔ یہ سلسلۂ کوہ بتدریج (Guonea) میں فوٹا جالون کے پہاڑوں پر ختم ہوتا ہے۔ لائبیریا کے علاقوں میں متعدد چھوٹی چھوٹی نہریں رواں ہیں جن کا رخ جنوب میں ساحلی جانب ہے۔

لائبیریا کے اصلی باشندے وہ آزاد حبشی ہیں جو شمالی و جنوبی امریکہ سے نقل مکانی کر کے وہاں آباد ہوئے تھے۔ اس کی مجموعی آبادی میں یہ لوگ ۵% کے قریب ہیں، لیکن اکثریت کا تعلق تقریباً بیس حبشی قبیلوں سے ہے۔ جن کو زبان و بول چال کے لحاظ سے چار گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے سوننکی، ماندنج اور منڈی وغیرہ زبانیں یہاں زیادہ نمایاں ہیں۔ ان کے علاوہ بھی متعدد زبانیں بولی جاتی ہیں، تاہم انگریزی سرکاری زبان ہے۔ وہاں کی کل آبادی ۱۸۸۰۳۱۸ ہے (۱)

اس کے باشندے زراعت پیشہ ہیں۔ چاول، باجرہ، کاسافا (۲) کیلا وغیرہ کی کاشت ہوتی ہے۔ کاکاؤ (۳) دودھ، حب الکولا (۴) بادام ہندی اور مطاط (۵) وغیرہ سے بھی زر مبادلہ حاصل ہوتا ہے، معدنی اشیاء میں خام لوہا، سونا اور تانبا وغیرہ بھی یہاں کے نفع بخش ذرائع آمدنی ہیں،

اسلام کی آمد مرابطین کے زمانے میں مجاہدین کی سرگرمیاں سنغال (Sengal) کے اطراف اور غینیا کے علاقہ فوٹا جالون میں شروع ہوئیں تو یہ علاقہ بھی مذہب اسلام کی اثر پذیری سے نہ بچ سکا۔ پھر ساتویں صدی ہجری میں ہوسہ، فولانی، تکرو اور ماندنجو کے مبلغین کی بدولت ان علاقوں میں اسلامی دعوت و تبلیغ کو مزید فروغ حاصل ہوا اور جنوب میں ساحلی علاقوں کو قبیلہ ماندی کے مسلمانوں نے متاثر کیا۔ ۱۶۷۵ء میں فولانی کے کچھ لوگ لائبیریا کے ساحل تک پہنچے۔ اس کے بعد میلیا کی مسلم ریاست کی جانب سے بھیجے گئے کچھ مجاہدین نے وہاں جاکر مستقل بود و باش اختیار کی اور سولیما کے بت پرستوں میں اسلام کی خوب نشر و اشاعت کی۔ اس سلسلے میں ابراہیم موسیٰ اور

(۱) ورلڈ ریفرنس اٹلس کے مطابق لائبیریا کی کل آبادی ۳۰ لاکھ ہے۔ (۲) اس لفظ کی تحقیق نہیں ہوسکی۔ (۳) خط استواء پر واقع علاقوں کی نشیب زمینوں میں اگنے والا پھلدار درخت ہے جس کے پتے چوڑے اور پھول چھوٹے ہوتے ہیں اسی سے معجون شوکولا بھی بنایا جاتا ہے۔ (۴) یہ اصلاً افریقہ کے خط استواء پر واقع علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ گرم علاقوں میں اسکی کھیتی کی جاتی ہے۔ (۵) اونٹ کا گاڑھا اور گاڑھا دودھ۔ (مترجم)

ابراہیم سوری نے اہم خدمت انجام دی۔ ان دونوں نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز فوجوما (Voinjama) کو بنایا۔ مسجدیں اور مدرسے قائم کیے۔ سولیما کے اسلام کی جانب رغبت کے بعد فولانی اور سولیما نے باہم متحد ہوکر اشاعت اسلام کی اور تیرہویں صدی ہجری مطابق انیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک لائبیریا کا پڑوسی شہر (Surraleone) بھی مذہب اسلام سے نا آشنا نہیں رہا جس کا اندازہ برطانوی سیرالیون کمپنی کے قیام کے دوران ۱۸۰۲ء میں پیش کی گئی مجلس العموم البرطانوی کی اس قرارداد سے ہوتا ہے، جس میں چھ یا چھ سے زائد اشخاص کے اکٹھا ہوکر اقامت دین اور مسجدیں تعمیر کرنے کا ذکر ہے۔ اس قرارداد سے چند اور باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ یوروپی استعمار سے قبل مغربی افریقہ کے ساحل پر اسلام پہنچ چکا تھا، دوسرے یہ کہ دشمنان اسلام خود اس بات کے گواہ ہیں کہ اسلام پسندوں نے یہاں پرامن طریقے سے اسلام کی نشر و اشاعت کی اور ان علاقوں کے سکون کو درہم برہم نہیں کیا تیسرے یہ کہ اسلام نے اصنام پرستی کو ختم کیا اور چوتھے یہ کہ دعوت اسلامی کی نشر و اشاعت میں نہایت تیزی دکھائی۔ جس کی وجہ سے استعماری طاقتیں اسلام کے زیر اثر علاقوں میں مختلف طریقوں سے اس کے خلاف محاذ آرائی میں سرگرم ہوگئیں اور لائبیریا میں دعوت اسلامی کو مسلسل چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اسلامی مصادر سے معلوم ہوتا ہے کہ لائبیریا میں مسلمان ۳۳% ہیں اور وہ اس کے اندرونی حصوں میں آباد ہیں۔ وہاں کے اہم شہروں میں مسجدیں اور مدرسے بھی قائم ہیں، جن سے اسلام کا بول بالا ہو رہا ہے۔

لائبیریا کے مسلمانوں کا تعلق متعدد قبائل ماندنج، ماندنجو وغیرہ سے ہے۔ آخر الذکر قبیلہ دیولا اور فای پر مشتمل ہے اور یہ لوگ قبیلۂ ماندنج کی ایک شاخ سے منسوب ہیں۔ ان کی اکثریت زراعت پیشہ ہے، بعض لوگ تجارت پیشہ بھی ہیں۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں قبیلۂ فای اسلام سے مشرف ہوا، قبیلۂ سوننکی سے تعلق رکھنے والے کچھ مسلمان بھی لائبیریا میں ہیں۔ لائبیریا کے مسلمانوں کو قادیانیت، مسیحیت اور صیہونیت سے خطرہ لاحق ہے۔ وہاں کے مسلمان راست عقائد سے بے بہرہ

ہیں۔عیسائی تنظیموں کے لئے ان سادہ لوحوں کو گمراہ کرنا آسان ہے۔حکومت ان کی پشت پناہی کرتی ہے کیوں کہ حکام کی اکثریت عیسائی مذہب سے وابستہ ہے۔لائبیریا کے مسلمانوں کی ذہنی، فکری اور تہذیبی اصلاح وتربیت کے لئے راسخ العقیدہ افراد پر مشتمل تنظیم اور دینی مدارس کا قیام ضروری ہے تا کہ وہاں کے مسلمان فرق ضالہ اور عیسائیت وصیہونیت کے اثرات سے محفوظ رہیں۔

لائبیریا میں چار مسلم تنظیمیں ہیں:

(۱) مجلس الاسلامی اللیبیری (۲) المؤتمر الاسلامی

(۳) الاتحاد الاسلامی (۴) حلف سلافیا الاسلامی

۱۹۷۴ء میں Monrovia میں ان تنظیموں کے سربراہوں کی کانفرنس ہوئی، جس کے بعد المجلس الاسلامی اللیبیری وجود میں آئی۔جو اپنی اچھی کارکردگی اور معاشرتی خدمات کے سبب بعد میں لائبیریا کے مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم کی حیثیت سے سامنے آئی۔۱۹۷۵ء میں حکومت نے اس کو باضابطہ منظوری دی، حکومت سے اچھے روابط کی بنا پر اس تنظیم نے چھوٹے بڑے تقریباً پینتالیس مدرسے قائم کئے جس میں حکومت کا تعاون ان کو میسر آیا۔اسی طرح اس تنظیم نے مسلم بچوں کی بنیادی تعلیم کے لئے مکاتب قائم کئے اور جمعہ کے روز ایک گھنٹہ ''صوت الاسلام'' کے نام سے ٹیلی ویژن اور ریڈیو پروگرام کی منظوری بھی حاصل کی۔اس طرح گاہے بگاہے یہ تنظیم ان کی مدد بھی کرتی ہے۔

سعودی حکومت کے ادارہ البحوث العلمیہ والافتاء والدعوۃ والارشاد (مکہ مکرمہ) کے زیر انصرام ایک اسلامی مدرسہ کا قیام عمل میں آیا۔لائبیریا میں قابل ذکر تعداد ان مدرسوں کی ہے، جس میں عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ مسلم بچے دینی تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں۔یہاں کی مسلم تنظیمیں بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے متعدد اسلامی ممالک میں روانہ کرتی ہیں۔سعودیہ میں ان کی ایک بڑی تعداد ہے۔نیز اس تنظیم نے اعلی اسلامی تعلیم کے لئے بڑے بڑے مدرسے اور کالجز کھولنے کا پروگرام بنایا ہے۔اس نے مونروفیا میں ایک مسجد، معلمین کی تربیت اور اسلام کی دعوت کا ایک مرکز قائم کرنے کا منصوبہ بنایا جب کہ رابطۂ عالم اسلامی کا مرکز پہلے ہی سے وہاں قائم ہے۔جس کے سرپرست حاجی موسیٰ کونزیا ہیں۔اس مرکز نے لائبیریا کے مسلمانوں کی ثقافتی اور مادی امداد کی پیش کش بھی کی ہے۔

(ماخوذ از التضامن الاسلامی، مکہ مکرمہ، دسمبر ۱۹۹۰ء)

معارف کی ڈاک

دینی تعلیمی کونسل کے ساتھ دھوکہ

مکرمی ومحترمی! سلام مسنون۔

چند برسوں سے دینی تعلیمی کونسل کے ساتھ کچھ لوگوں نے ایک بڑا دھوکا یہ کررکھا ہے کہ اس کی کتابیں جعلی طور پر چھپوا کر اور لوگوں کو زیادہ کمیشن دے کر سپلائی کرنی شروع کردی ہیں(۱)، جس کے نتیجہ میں دینی تعلیمی کونسل کو لاکھوں روپیہ کا نقصان ہوا، جو اس تحریک کی آمدنی کا اصل ذریعہ ہے۔ظاہر ہے اس کا اثر کام پر بھی پڑے گا، جن اضلاع میں نمایاں طور پر یہ بات ہے ان میں سرفہرست بستی، سدھارتھ نگر، الہ آباد، رائے بریلی، گورکھپور، سہارنپور، وارانسی اور بعض دوسرے اضلاع ہیں، یہ سلسلہ اجتماعی کوشش سے اور براہ راست دلچسپی لینے سے ختم ہوسکتا ہے۔خصوصیت سے جو حضرات اضلاع کے ذمہ دار اور بااثر لوگ ہیں ملک کے بدلتے پس منظر میں تاریخ کو جس طرح مسخ کیا جارہا ہے اور قومی یکجہتی کو ختم کرنے کے لئے جس قسم کی کتابیں رائج کی جارہی ہیں ان کو تعلیم کا ذریعہ بنایا جارہا ہے اس کو نظر انداز کرنا انتہائی خطرناک ہے۔ملک میں نفرت اور بدگمانی اگر ابتدائی عمر سے بڑھے گی تو آگے چل کر اس کے نتائج بہت بھیانک ہوں گے اس لئے تمام صاحبان فکر اور ہمدردانِ قوم وملت کی ذمہ داری ہے کہ لوگوں کو اس مسئلہ سے باخبر کریں اور ان کو اس سلسلہ میں کوشش کرنے پر آمادہ کریں۔

محمد اشتیاق حسین قریشی

جنرل سکریٹری دینی تعلیمی کونسل

لکھنؤ

(۱) معارف: دار المصنفین کے ساتھ بھی یہی ستم ہورہا ہے۔

معارف کا ایک مضمون

منگرول پیر

۴؍ دسمبر ۲۰۰۰ء

مکرمی و محترمی اصلاحی صاحب ! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

میں ''اردو نثر کے ارتقاء میں دار المصنفین اعظم گڑھ کی خدمات'' پر امراؤتی یونیورسٹی (مہاراشٹر) سے تحقیقی مقالہ لکھ رہا ہوں۔ اس کا پانچواں باب ''ماہنامہ معارف کا اجراء: اغراض و مقاصد'' ہے۔ اس سلسلے میں معارف کے گذشتہ شماروں کا بغور مطالعہ کرنا پڑا، مطالعہ کے دوران معارف کے مارچ تا مئی ۱۹۹۹ء کے شماروں کا باریک بینی سے مطالعہ کیا تو تینوں شماروں میں ''اردو کی حمدیہ شاعری کا جائزہ'' پڑھ کر نہایت استعجاب ہوا، کیوں کہ اس میں ان ہی باتوں کا اعادہ ہے جو چند ماہ قبل اپنے سپروائزر (پی، ایچ، ڈی کے گائیڈ) استاذ گرامی ڈاکٹر سید یحیٰی نشیط صاحب کلگاؤں ضلع ایوت محل (مہاراشٹر) کے تحقیقی مقالے میں پڑھ چکا تھا۔ حیران ہوں کہ آخر اتنی مماثلت کیسے!! ڈاکٹر یحیٰی نشیط صاحب سے تذکرہ کیا تو انہوں نے اپنے مقالے کی زیراکس مجھے عنایت کی، جو بطور ثبوت آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، فیصلہ آپ خود کیجئے گا۔

پورا مضمون معمولی الفاظ کے رد و بدل کے ساتھ ڈاکٹر محمد اسمٰعیل آزاد صاحب فتحپوری نے 'معارف' جیسے موقر رسالے میں شائع کرنے کی جسارت کی۔ دراصل یہ مضمون ڈاکٹر سید یحیٰی نشیط صاحب کے تحقیقی مقالے ''اردو شاعری میں مذہبی رجحانات'' کے باب دوم کی ہو بہو نقل ہے، معارف جیسے موقر جریدہ میں ایسے مضامین کا شائع ہونا خود معارف کے وقار کو مجروح کرتا ہے (۱) آپ سے پرخلوص التماس ہے کہ اس ضمن میں 'اداریے' میں اس پر اظہار نکیر کریں اور صاحب مضمون کو اس عمل سے باز آنے کی تاکید کریں۔ (۲)

حوالے اور ثبوت کے لئے مذکورہ مضمون کے زیراکس کے چار اوراق منسلک ہیں۔ معارف مارچ ۹۹ء کے صفحہ ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، کی سطور ڈاکٹر یحیٰی صاحب کے مقالے کے باب دوم کے صفحات کی نقل ہے۔ اسی طرح معارف اپریل ۹۹ء کا صفحہ ۲۸۵ بھی صاحب موصوف کے مقالے سے منقول ہے اور اشعار حذف کر دیئے گئے ہیں، اور بھی صفحات ثبوت کے طور پر پیش کر سکتا تھا لیکن خط کی طوالت اور ضخامت کو مد نظر رکھتے ہوئے صرف چار صفحات ارسال کر رہا ہوں۔ آخر میں مثبت ردِ عمل کا متوقع ہوں، امید کہ مع الخیر ہوں گے۔ تمام رفقاء کی خدمت میں پرخلوص سلام عرض ہے۔

راقم ۔۔۔۔ نذیر احمد قریشی کارنجوی

(۱) بالشبہ۔ (۲) بہتر ہے کہ ڈاکٹر صاحب خود ہی اس کے متعلق ارشاد فرمائیں۔

ادبیات

صبح ولی نامہ

بہ مناسبت سرودن چہار غزل در جواب غزل بیدل توسط آقای پروفسور دکتر ولی الحق انصاری لکھنوی

(بہ پیروی یک غزل ابو المعالی میرزا بیدل عظیم آبادی)

از ڈاکٹر محمد حسین تسبیحی رہا ٭

آمدہ نور خدا نور جہان صبح ولی
جلوۂ لطف و صفا پاکیزہ جان صبح ولی

سر بہ سر لطف سخن قلب مرا لرزاندہ است
کاشف مہر و وفا شد جاودان صبح ولی

بیدل خوش گفت و گو آوردہ صبح عاشقی
نازنازان پای کوبان شادمان صبح ولی

مشرق عشق خدا روشن شدہ از نور صبح
صبح خوبان گل فشانان جان جان صبح ولی

کاخ علم و معرفت آباد د خوش از لکھنؤ
تا ولی الحق در آن دار الامان صبح ولی

خوش درخشید آفتاب از بیدل اندر قلب او
گوییا انصاری آوردہ جہان صبح ولی

قصر شیرین گشتہ آباد از دل فرہاد ما
چون فرنگی خوش محل شاہ جہان صبح ولی

زینت فارسی شدہ در پہنۂ ہندوستان
زندہ انصاری ولی الحق جان صبح ولی

غالب شیرین سخن زندہ شدہ در ملک عشق
دہلی و لاہور نو زندہ دلان صبح ولی

بوسہ ہا نذر ولی الحق انصاری بود
تا کہ در دار الامان شد ضوفشان صبح ولی

٭ کتاب خانہ گنج بخش مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان۔ خانہ ۳۔ کوچہ ۸ کوہستان روڈ، ایف ۸/۳۔ اسلام آباد۔ موصوف کے گرامی نامہ کا اقتباس ملاحظہ ہو" مجلہ معارف را می خوانم و فائدہ معنوی و روحانی می گیرم جناب عالی و نویسندگان مجلہ مطالب ادبی و علمی خوب می نویسند"

معارف کا ایک مضمون

منگرول پیر

۴ر دسمبر ۲۰۰۱ء

مکرمی و محترمی اصلاحی صاحب ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں "اردو نثر کے ارتقاء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ کی خدمات" پر امراؤتی یونیورسٹی (مہاراشٹر) سے تحقیقی مقالہ لکھ رہا ہوں۔ اس کا پانچواں باب "ماہنامہ معارف کا اجراء: اغراض و مقاصد" ہے۔ اس سلسلے میں معارف کے گذشتہ شماروں کا بغور مطالعہ کرنا پڑا، مطالعہ کے دوران معارف کے مارچ تا مئی ۱۹۹۹ء کے شماروں کا باریک بینی سے مطالعہ کیا تو تینوں شماروں میں "اردو کی حمدیہ شاعری کا جائزہ" پڑھ کر نہایت استعجاب ہوا، کیوں کہ اس میں ان ہی باتوں کا اعادہ ہے جو چند ماہ قبل اپنے سپروائزر (پی، ایچ، ڈی کے گائیڈ) استاذ گرامی ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط صاحب کلگاؤں ضلع ایوت محل (مہاراشٹر) کے تحقیقی مقالے میں پڑھ چکا تھا۔ حیران ہوں کہ آخر اتنی مماثلت کیسے!! ڈاکٹر یحییٰ نشیط صاحب سے تذکرہ کیا تو انہوں نے اپنے مقالے کی زیراکس مجھے عنایت کی، جو بطور ثبوت آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، فیصلہ آپ خود کیجئے گا۔

پورا مضمون معمولی الفاظ کے ردوبدل کے ساتھ ڈاکٹر محمد اسمعیل آزاد صاحب فتحپوری نے معارف' جیسے مؤقر رسالے میں شائع کرنے کی جسارت کی۔ دراصل یہ مضمون ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط صاحب کے تحقیقی مقالے "اردو شاعری میں مذہبی رجحانات" کے باب دوم کی ہو بہو نقل ہے، معارف جیسے مؤقر جریدہ میں ایسے مضامین کا شائع ہونا خود معارف کے وقار کو مجروح کرتا ہے (۱) آپ سے پرخلوص التماس ہے کہ اس ضمن میں 'اداریے' میں اس پر اظہار نکیر کریں اور صاحب مضمون کو اس عمل سے باز آنے کی تاکید کریں۔ (۲)

حوالے اور ثبوت کے لئے مذکورہ مضمون کے زیراکس کے چار اوراق منسلک ہیں۔ معارف مارچ ۹۹ء کے صفحہ ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، کی سطور ڈاکٹر یحییٰ صاحب کے مقالے کے باب دوم کے صفحات کی نقل ہے۔ اسی طرح معارف اپریل ۹۹ء کا صفحہ ۲۸۵ بھی صاحب موصوف کے مقالے سے منقول ہے اور اشعار حذف کر دیئے گئے ہیں، اور بھی صفحات ثبوت کے طور پر پیش کر سکتا تھا لیکن خط کی طوالت اور ضخامت کو مدنظر رکھتے ہوئے صرف چار صفحات ارسال کر رہا ہوں۔ آخر میں مثبت ردِ عمل کا متوقع ہوں، امید کہ مع الخیر ہوں گے۔ تمام رفقاء کی خدمت میں پرخلوص سلام عرض ہے۔

راقم ـــــ نذیر احمد قریشی کارنجوی

(۱) بلاشبہ۔ (۲) بہتر ہے کہ ڈاکٹر صاحب خود ہی اس کے متعلق ارشاد فرمائیں۔

ادبیات

صبح ولی نامہ

بہ مناسبت سرودن چہار غزل در جواب غزل بیدل توسط آقای پروفسور دکتر ولی الحق انصاری لکھنوی

(بہ پیروی یک غزل ابوالمعالی میرزا بیدل عظیم آبادی)

از ڈاکٹر محمد حسین تسبیحی رہا ٭

آمدہ نور خدا نور جہاں صبح ولی
جلوۂ لطف و صفا پاکیزہ جان صبح ولی

سر بہ سر لطف سخن قلب مرا لرزاندہ است
کاشف مہر و وفا شد جاودان صبح ولی

بیدل خوش گفت و گو آوردہ صبح عاشقی
ناز نازانٔ پای کوبان شادمان صبح ولی

مشرق عشق خدا روشن شدہ از نور صبح
صبح خوبان گل فشانان جان جان صبح ولی

کاخ علم و معرفت آباد و خوش از لکھنؤ
تا ولی الحق در آن دار الامان صبح ولی

خوش درخشید آفتاب از بیدل اندر قلب او
گوییا انصاری آوردہ جہان صبح ولی

قصر شیرین گشتہ آباد از دل فرہاد ما
چون فرنگی خوش محل شاہ جہان صبح ولی

زینت فارسی شدہ در پہنۂ ہندوستان
زندہ انصاری ولی الحق جان صبح ولی

غالب شیرین سخن زندہ شدہ در ملک عشق
دہلی و لاہور نو زندہ دلان صبح ولی

بوسہ ہا نذر ولی الحق انصاری بود
تا کہ در دار الامان شد ضو فشان صبح ولی

٭ کتاب خانہ گنج بخش مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان۔ خانہ ۳۔ کوچہ ۸ کوہستان روڈ، ایف ۸/۲۔۱ اسلام آباد۔ موصوف کے گرامی نامہ کا اقتباس ملاحظہ ہو "مجلہ معارف را می خوانم و فائدہ معنوی و روحانی می گیرم جناب عالی و نویسندگان مجلہ مطالب ادبی و علمی خوب می نویسند"۔

شوق دیدار ولی الحق انصاری به دل — بیدل از ملک سخن گوهر نشان صبح ولی

ای معارف زنده و پاینده باش صبح و شام — چون که اعظم گڑھ بود خنده دہان صبح ولی

مجلس دار المصنفین مظہر عشق و ادب — اجتماع ہر مصنف شادمان صبح ولی

گوہر تاج محبت گشته الماس سخن — اینک آمد کوه نور از آسمان صبح ولی

یک غزل پیوستهٔ جان ولی، بیدل شده — چارمین آمد روان از گلستان صبح ولی

روشنی بخشنده است صبح ولی از لکھنؤ — نور حق از لکھنؤ روشنگران صبح ولی

گر ہمی خواہی که بینی صبح روشن از وفا — رو سفر کن با امیر کاروان صبح ولی

ہر سحر گہ می رسد باد خنک در جان ما — چون نسیم صبح گاہی شد وزان صبح ولی

خاک پای عاشقان راه حق شد توتیا — چون انا الحق آمده از کشتگان صبح ولی

سر زده داخل مشو در لکھنؤ ای جان من — چون ولی الحق در آن گشته جہان صبح ولی

جملہ انصار محبت نعره زن در لکھنؤ — از ضیاء الدین اصلاحی دمان صبح ولی

سر به سر پیمان آزادی ز اعظم گڑھ شنو — شبلی نعمانی آن روح الامان صبح ولی

این زبان فارسی حرف دل و جان ہمه — راه تسلیم و رضای مردمان صبح ولی

کوچه کوچه، در به در این شاعر فارسی زبان — دل به دل راه آورد از حرز جان صبح ولی

پیکر عشق مجسم در ادب ظاہر شده — صف شکن کو شنده روشنگران صبح ولی

صوت خوش بر گوش من از شعر صبح آید ہمی — گوییا موسیقی آورد اصفہان صبح ولی

گوہر نقش جہان معرفت دارد به دل — پاکباز و پاکدل در ملک جان صبح ولی

ذره ذره آمده بوی خوش از لکھنؤ — بر دل و بر جان من خورشید بان صبح ولی

کشف محجوب حقیقت ذره سان مکشوف شد — رفرف معراج عشق آستان صبح ولی

گلبن پاک وفا آمد به خانمان ما — ساربان عاشقی با اشتران صبح ولی

بلبل باغ "رہا" چہچہ زنان در آسمان

شادمان از خواندن صبح دمان صبح ولی

غزل

(در زمین نظیری نیشاپوری)

از پروفسور محمد ولی الحق انصاری ؎

طبع فکر انگیزم افسردن نمی داند که چیست — این گل صد برگ پژمردن نمی داند که چیست

در تلاش راه عرفان ہر که بازد زندگی — آن شہید جستجو مردن نمی داند که چیست

تلخ کامی در وجودم تا بحدی جای کرد — دل فریب آرزو خوردن نمی داند که چیست

من ندانم سایهٔ نخل مسرت کین نہال — از تہ دل سر بر آوردن نمی داند که چیست

دور باش از اختلاط او که گلچین ہوس — گل ز باغ عشق آوردن نمی داند که چیست

گشته ام از برگ عشرت تا بحدی بی نیاز — دل بساط عیش گستردن نمی داند که چیست

آن که خو کرده است با تر دامنی آن رند مست — پیش واعظ دامن افشردن نمی داند که چیست

مصرع خوب نظیری یاد می آید مرا — ہر که دل در باختهٔ دل بردن نمی داند که چیست

زندهٔ جاوید باشد کشتهٔ راه وفا — آن شہید راه حق مردن نمی داند که چیست

گشت آزرده ولی از دست یاران عزیز

دیگران را لیک آزردن نمی داند که چیست

؎ ۲۷۰، فرنگی محل، لکھنؤ۔

مطبوعات جدیدہ

ہندوستان و ممالک غیر از جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۷۸، قیمت ۱۲۵ روپے، پتہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔

جمہوریہ ہند کے مرحوم صدر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے اوصاف و کمالات میں تعلیم و تدریس، سیاست، قیادت، خطابت اور سلیقہ انتظام و انصرام وغیرہ کے علاوہ ان کی انشا پردازی اور سلیقہ تحریر کو امتیازی شان حاصل ہے، ان کی بے شمار تحریریں رسائل و جرائد میں خصوصاً جامعہ میں موتیوں کی طرح بکھری ہوئی ہیں، ۱۹۹۷ء میں ان کی پیدائش کا صد سالہ جشن ہوا، اس موقع پر خدا بخش لائبریری نے اپنے محسن و کرم فرما اور قدردان شخصیت کو خراج محبت و عقیدت پیش کرنے کی غرض سے ان کی تمام تحریروں کو یکجا کرنے اور مختلف موضوعات کے تحت مرتب کرنے کا بیڑہ اٹھایا، زیر نظر کتاب اسی منصوبے کی ایک شکل ہے جس میں ذاکر صاحب کی ان تحریروں کو یکجا کیا گیا ہے جن کا موضوع بیرون ہند کے ممالک اور ان کے مسائل سے ہے، ۳۱ء سے ۳۹ء تک کی دنیا جن سیاسی، معاشی اور حربی مسائل و مشکلات سے دوچار تھی، ان کا عالمانہ جائزہ اس کتاب کے ذریعہ مل جاتا ہے، امریکہ، جرمنی، انگلستان، فرانس، اٹلی، چین، جاپان، بلقان، یونان، حبش، فلسطین، عراق و ترکی وغیرہ کے حالات کا تجزیہ ان تحریروں میں جس طرح کیا گیا ہے وہ ان ممالک اور نصف صدی کے پرآشوب عہد کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے معلومات افزا ہونے کے علاوہ بصیرت افروز بھی ہے، درمیان میں کانگریس اور ہندوستانی مسلمانوں پر بھی چند باتیں آگئی ہیں اور یہ

خاص طور پر بہت دلچسپ ہیں، مثلاً ۳۵ء کے جامعہ میں ان کی یہ عبارت ملاحظہ ہو کہ "ہندوستانی مسلمانوں میں خودداری، عزت نفس، حمیت اور جسارت پیدا ہو رہی ہے، انہوں نے مختلف راہ رووں کے ساتھ تھوڑی تھوڑی دور چل کر عبرت حاصل کی ہے اور یہ سمجھ لیا ہے کہ ان کے درد کا علاج وہ نہیں جو دوسروں کا ہے، ... بے کس اور عاجز بن کر کبھی سرکار اور کبھی ہندوؤں سے رحم و کرم کی التجا کرنا فضول ہے ... اقتدار اور رہنمائی کی جگہوں میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے، خود غرض اغیار اپنا کام نکالنے کے لئے انہیں کبھی کبھی اونچی جگہوں پر بٹھا دیتے ہیں، لیکن دوسروں کے ہاتھ سے اس طرح گدی پر بٹھایا جانا مسلمان کی غیرت کے منافی ہے"۔ خدا بخش لائبریری کی یہ خدمت بھی واقعی قدر و تحسین کے لائق ہے کہ آثار و نوادر علمیہ اس کی بدولت سہل الحصول ہو گئے ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ کا فلسفہ سیرت از جناب پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۱۳۹، قیمت ۶۵ روپے، پتہ: ادارہ علوم اسلامیہ/ شعبہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲۔

حجۃ الملۃ والدین حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تصانیف، ان کے علم و فضل، فکر و فلسفہ اور برصغیر کی دینی و علمی نشاۃ ثانیہ میں ان کے مرتبہ و مقام، ان کے طرز فکر کے غیر معمولی قبول عام کے مطالعہ و تجزیہ کی وقتاً فوقتاً کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ ادھر کچھ عرصے سے میراث ولی اللہی کے احیا میں مسلم یونیورسٹی کے بعض افاضل کی مساعی بھی شامل ہیں جس کا عملی ظہور ادارہ علوم اسلامیہ کے 'شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل' کی شکل میں ہوا، یہ کتاب اسی سیل کا ثمرہ ہے جس میں حجۃ اللہ البالغہ کے ایک مختصر باب 'سیر النبی صلی اللہ علیہ وسلم' کا مطالعہ اور تحلیل و تجزیہ کیا گیا ہے، فاضل مصنف کو سیرت نبویؐ کے مطالعہ سے خاص شغف ہے، اس موضوع پر ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

یہ کتاب بھی ان کی دیدہ ریزی وجاں کاہی کا عمدہ نمونہ ہے، اولاً انہوں نے باب مذکور کا اردو میں ترجمہ کیا پھر احادیث کی تخریج اور کارآمد حواشی سے مزین کیا اور آخر میں تحلیل و تجزیہ کے عنوان سے اس کے مختلف پہلوؤں کو شرح و بسط سے واضح کیا، حواشی خاص طور پر قابل ذکر اور اہمیت کے حامل ہیں جس میں انہوں نے شاہ صاحب کی تحریر کی خصوصیات مثلاً تصوف اور اسرار شریعت کے باب میں برموقع اور چست و شارے کئے ہیں، شاہ صاحب کے نظریہ خلیفۃ اللہ، استمام خلافت اور عالم شہادت میں عالم مثال کے احکام و واقعات کے ظہور جیسے امور کے متعلق ان حواشی میں اختصار لیکن مہارت سے توجہ دلائی گئی ہے مثلاً اولین صحابہ کرام میں شاہ صاحب کے دئے ہوئے ناموں کے متعلق صرف یہ جملہ ہے کہ "یہ بات خاصی معنی خیز ہے" بعض عام اور غیر مستند روایتوں کی شمولیت پر مولانا سید سلیمان ندوی اور دوسرے سیرت نگاروں کی تحقیق کی جانب اشارہ کر دیا گیا ہے، لیکن تحلیل و تجزیے میں مستند روایتوں کے ساتھ ضعیف اور کمزور روایات کے در آنے کو مجمع البحرین قرار دینا شاید تکلف بے جا ہے۔

تحقیقات مرتبہ جناب پروفیسر نذیر احمد، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۵۲۸، قیمت ۵۰۰ روپے، پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ ایوان غالب مارگ، نئی دہلی ۲

غالب انسٹی ٹیوٹ کا موقر سہ ماہی مجلہ "غالب نامہ"، قریب پچیس سال سے شائع ہو رہا ہے، اس کے بلند پایہ مضامین کے ایک انتخاب "تنقیدات" کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے۔ اب اسی انداز پر قریب پچیس تحقیقی مقالات کو زیر نظر مجموعہ میں یکجا کیا گیا ہے جس میں غالب کے عہد، لال قلعہ کی معاشرتی زندگی، عام علمی و فکری ماحول، کلکتے کا سفر، مکاتیب، نایاب و نادر تحریریں، معاصرین تذکرہ نویس، محققین و مقلدین، نسخہ حمیدیہ، نسخہ شیرانی، بیاض غالب اور

برہان قاطع وغیرہ پر بلند پایہ تحریریں آگئی ہیں جو تحقیق و تفحص کا قابل تقلید نمونہ ہیں، غالبیات کے موضوع پر داد تحقیق دینے والے ان مضامین کے مطالعہ و استفادہ سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔

غالبیات (کچھ مطالعے اور مشاہدے) از جناب کالی داس گپتا رضا، متوسط تقطیع عمدہ کاغذ اور بہتر کتابت و طباعت، صفحات ۲۴۱، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: ساکار پبلشرز پرائیوٹ لمٹیڈ، ۱۰ جوبلی بھون نمبر ۱، ۱۰ نیو مرین لائن، ممبئی - ۴۰۰۰۲۰۔

اس کتاب کے فاضل مولف، صاحب تصانیف کثیرہ اور غالبیات کے ماہرین میں ہیں۔ یہ کتاب بھی سلسلہ غالبیات کی ایک کڑی ہے جو اس لحاظ سے بہت خوب ہے کہ ایک طویل عرصے سے غالب کے مطالعے کے دوران ان کو جو باتیں نئی، دلچسپ اور قابل تصحیح نظر آئی اس کو انہوں نے نقل کر کے خود اپنی رائے سے آراستہ کر کے محفوظ کر لیا، اس طرح قریب ایک سو گیارہ موضوعات پر مفید تحریروں کا ایک خوبصورت اور رنگا رنگ گلدستہ تیار ہو گیا، وسعت مطالعہ کے علاوہ اس سے فاضل مولف کی قوت اخذ و نقد کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً ۱۹۶۹ء میں درفش کاویانی مطبوعہ لاہور کے ایک حاشیے کو نقل کر کے پروفیسر محمد باقر کی ایک غلطی کی تصحیح کرتے ہوئے لکھا کہ "حقیقت یہ ہے کہ جواہر سنگھ جوہر لکھنوی اور جواہر سنگھ جوہر خالق قطعہ دو مختلف شخصیتیں ہیں..." اس کے بعد چند سطروں میں اس اجمال کی توضیح ہے، چند سال پہلے شذرات سلیمانی طبع ہوئی تو انہوں نے اس سے ان اقتباسات کو جمع کیا جن میں مولانا سید سلیمان ندوی نے غالب کے اشعار سے استفادہ کیا ہے یا جہاں غالب کا ذکر ہے، مقالات شبلی پنجم میں خزانہ عامرہ کے ذکر میں علامہ شبلی نے لکھا تھا کہ "مرزا غالب وغیرہ کا خیال تھا کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا مذاق صحیح جو دوبارہ قائم ہوا وہ حضرت مظہر جانجاناں کے انتخاب ریزہ جواہر (خریطۂ جواہر) نے قائم کیا" ہندوستان میں فارسی شاعری کی تاریخ کو سمجھنے کے لئے فاضل مولف کی نظر میں یہ رائے

بڑا وزن رکھتی ہے، انہوں نے یہ بھی لکھا کہ خریطۂ جواہر مری نظر سے نہیں گزرا، حالانکہ شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم نے برسوں پہلے اس بیش بہا انتخاب کو ترجمے کے ساتھ دارالمصنفین سے شایع کیا تھا، اس طرح اس زنبیل سے بڑی قیمتی چیزیں آسانی سے ہاتھ آجاتی ہیں، اس کے متعلق یہ خیال درست ہے کہ جداگانہ نوعیت کی یہ تحریریں بہر حال غالبیات پر کارآمد ثابت ہوں گی۔

رئیس المناظرین حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری از جناب فضل الرحمن بن میاں محمد

متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، صفحات ۲۹۰، قیمت درج نہیں، پتہ: دارالدعوۃ السلفیہ، شیش محل روڈ، لاہور، پاکستان۔

گذشتہ صدی کے آغاز میں برصغیر میں جن علماء کا غلغلہ و شہرہ تھا ان میں مولانا ثناء اللہ امرتسری کا نام نمایاں ہے، عالم و محدث و خطیب سے زیادہ ان کی شہرت مناظر بلکہ اسلام کے مجاہد سپاہی کی حیثیت سے ہوئی، آریوں، عیسائیوں اور قادیانیوں سے ان کے مناظروں کی یاد اور ذکر آج بھی جوش و حرارت سے خالی نہیں، شر و فتن کے لحاظ سے آج کا دور بھی کم پرآشوب نہیں، اس لئے اس قسم کے تذکروں کی ضرورت ہے، لائق مصنف نے شاید اسی مقصد سے ایم اے کے مقالے کے لئے اس موضوع کا انتخاب کیا اور بڑے سلیقے سے مولانا مرحوم کے حالات اور ان کی دینی، علمی اور ملی خدمات کا جامع مرقع پیش کر دیا، ایک باب میں مولانا کے عہد کے سیاسی اور مذہبی حالات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے اس طرح یہ برصغیر خصوصاً مسلمانوں کے مذہبی و سیاسی تاریخ کا ایک باب بھی ہے، سنجیدہ علمی اسلوب اس کتاب کی بڑی خوبی ہے البتہ معارف کو المعارف اور جامعہ ملیہ کو جامع ملیہ لکھ دیا گیا ہے، ایک جگہ یہ جملہ ہے کہ "دیوبندی حضرات مسئلہ تقلید، فاتحہ، قراۃ خلف الامام، آمین بالجہر، رفع یدین اور بیس تراویح کے علاوہ دوسرے مسائل میں اہل حدیث کا ساتھ دیتے ہیں"، یہاں علاقہ اور بجز کے فرق کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ یہ کتاب ایک مدت ہوئی موصول ہوئی تھی لیکن افسوس ہے کہ تبصرہ میں خاصی تاخیر ہوگئی۔

ع۔ص۔